سکوت

(افسانوی مجموعہ)

ایف آزاد دلنوی

بصد خلوص

بنام

محترم سلیم سالک

صاحب

Fareed

سکوت

(افسانوی مجموعہ)

ایف آزاد دلنوی

نام کتاب	:	سکوت (افسانوی مجموعہ)
مصنف	:	ایف آزاد دلنوی (فیاض احمد راتھر)
سالِ اشاعت	:	۲۰۱۸ء
سائز	:	23X36/16
تعداد	:	۵۰۰
قیمت		۳۰۰/روپیہ
طباعت	:	**الحیات** پرنٹوگرافرس سرینگر 9419403126

Sakoot (Afsanvi Majmooah)

by

F. Azad Delnavi

Cell : 09906484847

E-mail : fazaddelnavi@gmail.com

ترتیب



پیش لفظ

گزشتہ تیس برسوں کے دوران ریاست جموں کشمیر کے حالات وواقعات کے پس منظر میں عوامی سطح پر جو بیداری پیدا ہوئی ہے وہ اب واضح طور پر نظر آرہی ہے ظاہر ہے کہ ادبی اور علمی اعتبار سے ہمارے قلمکار بھی اسی بیداری کے پس منظر میں اپنے تخلیقی جوہر دکھانے میں مصروف ہیں۔اوراس فکری بیداری کے نتیجے میں اب جو افسانوی ادب سامنے آرہا ہے۔لگتا ہے جیسے وہ اپنے انداز، اپنے اسلوب اوراپنے پلاٹ کی سبب افسانہ نگار کے لاشعور کے تہہ خانوں سے برآمد ہورہا ہے ہمارے ان افسانوں میں عشق ومحبت اور ہجر ووصال کی باتیں بھی ملتی ہیں لیکن ملکی اور معاشرتی مسائل، اور نفسیاتی الجھنوں اور سنجیدگیوں کو ترجیحی طور پر پیش کیا جارہا ہے ہمارے آج کے افسانہ نگار بہتر طور سے اپنے اردگرد کے حالات وحادثات پر نہ صرف گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ اپنے افسانوں کے لئے بہتر مواد حاصل کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔

ریاست جموں کشمیر میں نئے افسانہ نگاروں کی فہرست زیادہ طویل نہیں ہے لیکن گزشتہ چند برسوں کے دوران جو افسانہ نگار سامنے آئے ہیں ان میں چند ایک افسانے تخلیق کر کے افسانوی نقشے پر اپنا نام لکھوانے میں کامیاب ہو چکے ہیں ان افسانہ نگاروں میں ایف آزاد دلنوی کا نام بھی نمایاں طور پر نظر آنے لگا ہے۔ایف آزاد دلنوی صاحب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دلنہ بارہمولہ سے تعلق رکھتے ہیں دلنہ ادبی

اور علمی تعلق سے ایک جانا پہچانا علاقہ ہے دلنہ کی مٹی سے جنم لینے والے بہت سارے شعراء اور ادبا ریاست کی علمی اور ادبی تاریخ میں اپنا نام اور اپنا مقام بنا چکے ہیں اور ریاست کی ادبی تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ بہر حال بات الیف آزاد دلنوی کی ہو رہی ہے جو ایک افسانہ نگار ہیں دلنوی صاحب کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''سکوت'' اب آپ کے سامنے ہے۔ اس میں تیس کہانیاں شامل کی گئی ہیں ان میں سے اکثر کہانیاں ریاست کے معروف اخبار کشمیر عظمیٰ کے ادب نامہ میں شائع ہو چکی ہیں کشمیر عظمیٰ کا ادب نامہ اب اس قدر مقبول ہو چکا ہے کہ نہ صرف ریاست کے قلمکار اس میں شامل ہو رہے ہیں بلکہ بیرون ریاست کے بہت سارے قلمکاروں کے تخلیقات بھی اس میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

الیف آزاد دلنوی اپنے افسانوں میں روزمرہ زندگی کے واقعات کو اپنے قلم کا نشانہ بناتے ہیں اور خاص طور سے کشمیری زندگی کے تلخ حقائق کی عکاسی کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ حقائق پیش کرتے ہوئے وہ مٹھاس بھری سلیس زبان کا استعمال کرتے ہیں یہ کہانیاں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کی بساط فکر وسیع ہے۔ وہ اسکولی سطح پر اردو پڑھاتے ہیں لہذا اس تعلق سے اُنھیں اردو زبان کے نازک گوشوں کو اپنی فکر کے وسیع حصار میں سمیٹ لینے میں کوئی دقعت نہیں ہوتی۔

آزاد دلنوی صاحب کشمیر اور کشمیر کے حالات سے بے خبر نہیں ہیں ان حالات وواقعات کو اپنی کہانیوں میں مختلف انداز سے پیش کرتے آرہے ہیں ''اُمید'' نامی افسانہ میں ریاست اور ریاستی عوام سے تعلق رکھنے والے ایک اہم انسانی مسئلے کی نشاندہی بڑے خوبصورت انداز سے کرتے ہیں۔ یہ دیکھئے۔۔۔۔!

اتنے میں ڈاکٹر فرحان، شہناز اور انکے رشتہ دار آپہنچے۔ گیٹ کھولا گیا تو سب گلے مل گئے ایسا گمان ہو رہا تھا کہ دونوں ممالک ایک ہو گئے ہیں۔ پھر اچانک ہوا میں

گولیاں چلیں۔سب لرز اُٹھے۔ایک فوجی گاڑی سے فوجی اُترے سٹریچر پر پڑی سر بریدہ لاش جونہی زمین پر رکھ دی گئی تو برگیڈیر کی کرخت آواز ہوا میں گونج اُٹھی۔''ڈاکٹر فرحان یہ تمہاری جاسوسی کا نتیجہ ہے۔تم دیش کے دشمن ہو''۔اُس کی آنکھوں پر کالی پٹی باندھی گئی۔اور گاڑی میں بٹھا کر اُسے لے جایا جارہا تھا کہ شہناز زور زور سے چلانے لگی۔''برگیڈیر صاحب!جب جب امن آشتی کی بات ہوتی ہے تب نئے بکھیڑے کھڑے کئے جاتے ہیں۔لاشیں بچھائی جاتی ہیں۔بے قصوروں کو سزا دی جاتی ہے۔اب انتہا ہوچکی ہے۔خدارا!اب بس بھی کرو۔''''شہناز میرا انتظار کرنا'' ڈاکٹر فرحان نے آواز دی۔اور وہ اُس کو دور تک دیکھتی رہی۔شہناز نے آسمان کی طرف نظریں اُٹھائیں اور ڈوبتے سورج سے نکلتی چھوٹی چھوٹی کرنوں کو دیکھ کر اُس کے دل میں ملن کی اُمید جاگتی رہی۔''

آزاد دلنوی سچائی اور سادگی کے ساتھ حالات و واقعات کو افسانوی روپ دیتے ہیں ابھی تو اُن کے ادبی سفر کا آغاز ہوا ہے اُن کی منزل ابھی دور سہی لیکن وہ جس حوصلہ مندی سے یہ سفر طے کررہے ہیں وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔مجھے یقین ہے کہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب وہ اپنی ادبی صلاحیتوں کے نتیجے میں افسانوی اُفق پر اپنے لئے جگہ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔لیکن شرط یہ ہے کہ نام پر نہیں کام پر توجہ دیں۔بہتر کام انجام دیکر نام خود ہی سامنے آئے گا اور ہاں اپنی افسانوی دنیا کو وسعت دینے کے لئے آزاد دلنوی کو اپنے افسانوں کی اشاعت کے لئے ریاست جموں کشمیر سے باہر کا رُخ کرنے کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے اس طرح ایک بڑا پلیٹ فارم فراہم ہوگا۔اس بڑے پلیٹ فارم کے ذریعہ اُن کے افسانوں کو پڑھنے اور پرکھنے کے لئے ان گنت قارئین سامنے آئیں گے۔

نور شاہ

اپنی بات

''سکوت'' افسانوی مجموعہ پیش کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ ایک افسانہ نگار اپنے عہد سے متاثر ہو کر ہی کچھ خلق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بڑی باریک بینی اور گہرائی کے ساتھ سماج میں رونما ہونے والے واقعات اور روزمرہ زندگی کے اتار چڑھاؤ کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے اور اسی مشاہدہ پر اس کے افسانوں کی بنیاد پڑتی ہے۔ وہ سماج سے خام مواد حاصل کرنے کے بعد اپنی تمام تر فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس مواد کو لفظی جامہ پہنا کر افسانوی صورت میں قارئین تک پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ قارئین اس کی تحریروں کا مطالعہ کر کے جب اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں تو اس سے افسانہ نگار کی تخلیقی صلاحیتوں کو ایک نئی جلا ملتی ہے اور اس کا عزم وحوصلہ بڑھ جاتا ہے۔

یہاں پر میں اپنے افسانوی سفر کا تذکرہ مناسب سمجھتا ہوں۔ طالب علمی کا زمانہ تھا میرے برادر اکبر جناب حفیظ اللہ راتھر صاحب اکثر و بیشتر اردو ناولیں پڑھا کرتے تھے چونکہ اردو ایک میٹھی اور شرین زبان ہے تو میں نے بھائی صاحب کی غیر موجودگی میں ان ناولوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ میں ایک الگ سی دنیا میں اپنی زندگی کے مزے لینے لگا۔ میں ناولوں کے مطالعے میں اس قدر منہمک ہو جاتا کہ بعض اوقات دوپہر کا کھانا کھانا بھی بھول جاتا۔ ان ناولوں کا مطالعہ کرنے سے میرے اندر کہانی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ دوسرا ایک محرک یہ بنا کہ میرے مرحوم والد جناب عبدالخالق

راتھر صاحب کے پاس اڑوس پڑوس کے لوگ اپنے لین دین کھاتے لے کر آتے اور شادی بیاہ کا لین دین لکھواتے رہتے۔ بظاہر یہ معمولی سی خدمت تھی مگر تھی خدمت خلق ہی۔ بقول علامہ اقبالؔ۔

ہیں جہاں میں لوگ وہی اچھے

آتے ہی جو کام دوسروں کے

والد صاحب کے اس عمل سے مجھے خدمت خلق کرنے کی تحریک ملی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اظہار خیال کا شوق بھی گُدگُدانے لگا۔ میں نے قلم کو اظہار خیال کا بہترین وسیلہ سمجھا۔

میں بچپن سے ہی کم گو اور سنجیدہ مزاج واقع ہوا ہوں۔ چونکہ شیر خواری میں ہی ماں داغ مفارقت دے گئی جو ایک بڑا صدمہ تھا۔ اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ جدائی کا احساس بھی بڑھتا گیا۔ اور میں تنہائیوں کے گھیرے میں آ کر سوچتا رہتا۔

میں نے کالج سے ہی صنف افسانہ میں طبع آزمائی کرنے کی ٹھان لی۔ اس دوران میں نے کئی کہانیاں لکھ ڈالی جنہیں مرے گھر میں بہت سراہا گیا۔ شومئی قسمت ’فارغ التحصیل ہوتے ہی وادی کے حالات دگر گوں ہو گئے اور بھاگم بھاگ کی وجہ سے زندگی کا تانا بانا بکھر کر رہ گیا جس سے قلم کاری میں کچھ وقت کے لئے ٹھہراؤ آ گیا جو میرے لئے کسی بڑے نقصان سے کم نہیں ہے۔

چونکہ میرا تولد دلنہ میں ہوا ہے اور ابتدائی تعلیم بھی یہی پر حاصل کی۔ یہاں کے ایک سرکاری اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر گورنمنٹ ڈگری کالج بارہمولہ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کر کے کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے فوراً بعد میں نے ایم۔ اے عمرانیات کی ڈگری بھی حاصل کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے دوران میرے عمو حاجی محمد مقبول اور خواجہ عبدالغنی راتھر میرا خاص خیال رکھتے تھے۔

دلنہ کی سرزمین علم وادب کے لحاظ سے بہت زرخیز مانی جاتی ہے اور یہاں آئے

دن ادبی محافل کا انعقاد ہوتا رہتا تھا ہوش سنبھالتے ہی میں نے اپنے آپ کو یہاں کے ان چمکتے ستاروں کے کہکشاں کے درمیان پایا جو ادبی اُفق پر اپنی چھاپ ڈال چکے تھے ۔جن میں نشاطؔ انصاری، قاضی ہلالؔ دلنوی، شاہد دلنوی، شیر علی مشغولؔ، رحمان ممتازؔ، ضمیر انصاری، میر منظور، علی حسرتؔ قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ سلیم سالک، جاوید آذر، ظہور ہائیگامی، عظیم تاپری اور میرے دو محترم استاد تفضّل حسین رضوی اور محمد مقبول رضوی میری کاوشوں کی سراہنا کرتے ہوئے میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔اور میں نے صنف افسانہ میں طبع آزمائی جاری رکھی۔

میں اپنے خاندان کے ان تابندہ ستاروں کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے علم کے میدان میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہاں کی تاریخ میں اپنی چھاپ ڈال دی۔اشفاق مقبول اس علاقے کے پہلے گولڈ میڈلسٹ فزکس ہیں جو اب محکمہ تعلیم میں بحیثیت لیکچرار تعینات ہیں۔راحیلہ حفیظ (بھتیجی) نے صوبے میں بارہویں جماعت میں اوّل پوزشن حاصل کر کے پورے علاقے کا نام روشن کیا جبکہ پمپوش عالم (بھتیجا) انگریزی زبان کے ایک ابھرتے کالم نگار کی حیثیت سے ادبی افق پر اپنی چھاپ ڈال چکا ہے امید قوی ہے کہ علم وادب کی مشعل کو جلائے رکھنے میں یہ اپنا بھرپور کردار نبھائیں گے اس کے علاوہ میرے دادا حاجی عبدلجبار راتھر اور پردادا غلام محمد راتھر اپنے وقت کے چند ایک پڑھے لکھے لوگوں میں شامل تھے۔

میں اپنی اہلیہ طاہرہ حسین کا تہ دل سے ممنون ہوں جو اکثر اوقات میرے افسانے پڑھ کر میرا حوصلہ بڑھاتی رہی۔

آخر پر میں قارئین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب کو پڑھیں اور اپنی قیمتی رائے سے مجھے نوازیں.................شکریہ

الیف آزادؔ دلنویؔ

اُمید

''وارڈ بوائے۔ سٹریچر لے آؤ۔ جلدی"

ڈاکٹر فرحان بپھر کر بولے۔ شہناز ایک قیمتی کار میں بے چین لیٹی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور ساڑھی بھی سر سے سرک کر تر ہوگئی تھی۔۔ وہ درد سے نڈھال کبھی دائیں بائیں تو کبھی اوندھے مُنہ گر جاتی منہ سے خون نکل رہا تھا۔ وہ پھیپھڑوں کے مرض میں مبتلا تھی۔ اپنی بیماری کا علاج کرانے ملک کی سرحد پار کر کے آئی تھی۔ ہمارے ملک میں! وہ بھی ہمارے ہی ملک کا حصہ تھا۔ لیکن فرقہ واریت اور آپسی نفرت کی وجہ سے ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ تب سے دونوں ممالک کی افواج ایک دوسرے پر بندوق تانے ہوئے ہیں۔

شہناز کے والد نواب سکندر حیات خان بہت متفکر تھے۔ شہناز ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بڑے نازوں سے پلی۔ اسکے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ اور وہ درد سے تلملا کر بول اُٹھی۔

''ڈاکٹر صاحب میں جینا چاہتی ہوں۔ مجھے بچا لیجئے۔"

''آپ ٹھیک ہو جائے گی۔" ڈاکٹر فرحان نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

وارڈ بوائے سٹریچر کھینچ کھینچ کر لے آیا۔

''چلو! جلدی کرو۔'' ڈاکٹر فرحان نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

شہناز بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔"

’’ذرا آرام سے" پھر ڈاکٹر فرحان کی آواز آئی۔

سٹریچر پر لٹاتے ہی شہناز کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ اور غش کھا کر وہ ایک دم ساکت ہوگئی۔ اُس کا جسم برف کی سل کی طرح ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور نواب صاحب گڑگڑاتے ہوئے بولے۔

’’ڈاکٹر میری ساری دولت لے لیجئے۔ مگر میری بیٹی کو بچا لیجئے۔

" آپ کی بیٹی ٹھیک ہو جائے گی۔ انشا اللہ! آپ دُعا کیجئے۔ ہم علاج کریں گے "۔ ڈاکٹر فرحان نے تسلی دی۔

شہناز کئی روز ایمرجنسی وارڈ میں زیرِ علاج رہی۔ اُسکے ٹیسٹ کرائے گئے مرض کی تشخیص ہوئی۔ اور ڈاکٹر فرحان نے علاج شروع کر دیا۔ دوا اثر کرنے لگی۔ اور شہناز کو افاقہ ہونے لگا۔

ایک مہینہ گزر گیا اب وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ اور بیشتر اوقات ڈاکٹر فرحان سے بات چیت کرتی رہتی۔ ایک سمے پر ڈاکٹر فرحان بولے۔

’’آپ کے زخم اب بھر آئے ہیں۔ آپ کو رخصت کرنا پڑے گا۔"

’’ڈاکٹر صاحب! آپ بھی کیا مذاق کر رہے ہیں"۔ "وہ درد بھرے لہجے میں بول پڑی۔

’’میں اپنا انجام جانتی ہوں۔ میرے پاس اب بہت کم وقت بچا ہے۔‘‘

’’آپ تو پہلے سے بہت زیادہ تندرست ہوگئی ہیں۔ اور۔۔۔۔ ہاں۔ آپ بہت جلد اپنے ملک جانے والی ہیں۔

’’ڈاکٹر صاحب! میں اب بھی خون کی قے کر رہی ہوں اور آپ کہتے ہیں۔ میں ٹھیک ہوگئی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب! کیوں جھوٹی تسلی دے رہے ہیں۔‘‘

وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

''میں تو بس دن گزار رہی ہوں۔ کیا پتہ کب بُلا وا آئے؟''

''ارے۔ آپ زندگی سے اتنی نراش کیوں ہو۔ دو ہفتے میں آپ ٹھیک ٹھاک ہوں گی۔ انشااللہ۔ اب آرام کیجئے۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر فرحان وہاں سے نکل گئے۔ اسپتال میں موجود لوگ شہناز کی مزاج پُرسی کرتے رہتے۔ اور اس کو دونوں ممالک کے ماحول میں کوئی فرق نہیں لگ رہا تھا۔ خوش مزاج سانولے لوگ، خوب رُو قد اور، محبتی اور ہمدرد۔

''سب ویسا ہی ہے۔ جیسے ہمارے ملک میں ہے۔'' وہ سوچ رہی تھی۔

شہناز بہت خوبصورت تھی۔ ایسا گمان ہوتا تھا کہ مصّور کائنات نے اُسکو فرصت میں تخلیق کیا ہے۔ اس میں کمال کی کشش تھی۔ شاید اسی لئے ڈاکٹر فرحان بار بار اس کے وارڈ میں آتے جاتے پوچھتے رہتے۔

''اب طبعیت کیسی ہے"۔

''ڈاکٹر صاحب: بہت بہتر ہے۔"

''اب آپ کچھ ہی دنوں میں اسپتال سے ڈسچارج ہو رہی ہیں۔"

'' ڈاکٹر صاحب! یہ آپکے علاج کا نتیجہ ہے جو میں اتنی جلد صحت یاب ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب! ایک بات کہوں"۔

''ہاں۔۔۔ہاں۔ کہئے۔

" یہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں"

''اور۔۔ میرے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ تو میری زندگی کے مسیحا ہیں۔"

ڈاکٹر فرحان پیار بھری نظروں سے اُسکو دیکھتے رہے۔

''اچھا! اور کیا کیا اچھا لگ رہا ہے۔"

''یہ ماحول، یہ آب وہوا، یہ لوگ۔ کیا یہ دونوں ممالک پھر سے۔۔۔!

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ لوگ آپسی سمبندھ بڑھائیں۔ آتے جاتے رہیں تو نفرت کی دیوار گر جائے گی۔ اور محبت کی فضا قائم ہوگی۔ یہ سرحد بے وقعت ہو کر رہ جائے گی۔"

''ہاں ڈاکٹر صاحب! یہ رنجشیں اور یہ سرحدی تناؤ کب تک مسلط رہے گا۔ کب تک ہم خوف کے سایے میں جیتے رہیں گے۔ ڈاکٹر صاحب! کبھی اس مار دھاڑ اور قتل وغارت کا انت تو ہونا ہے۔ ہمیں پیار محبت سے رہنا چاہیے۔ اچھے پڑوسیوں کی طرح۔

''صحیح۔ زبان خلق نقارے خُدا۔ خلق کا حلق کس نے بند کیا ہے۔ لوگوں کو یک جا ہونا چاہیے۔ اور امن آشتی کا نعرہ بلند کر کے انسانیت کے دشمنوں کو مات دینی چاہیے۔ لوگ ہی اصل طاقت ہیں۔ ہمیں جگہ جگہ احتجاج کرنا چاہیے۔ دھرنا دے کر بیٹھ جانا چاہیے جب تک یہ پکڑ دھکڑ، قتل وغارت اور سرحدی تناؤ ختم نہیں ہو جاتا۔ ہم غموں اور فکروں کے گرداب میں ڈوبے رہیں گے۔''

شہناز اسپتال سے ڈسچارج ہوئی تو ڈاکٹر فرحان بے صبری سے نیچے انتظار کر رہے تھے۔ وہ جب آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُتر رہی تھیں۔ تو ڈاکٹر فرحان نے زور سے آواز دی۔

''آیئے۔ آپ کا سامان گاڑی میں لدوا دیا ہے۔ آپ آرام سے بیٹھ جایئے۔"

وہ ہکا بکا ہو کر رہ گئی۔ وہ کچھ بولنے ہی والی تھی کہ ڈاکٹر فرحان نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

''چلئے بیٹھ جایئے"۔

وہ چار و نا چار گاڑی میں بیٹھ گئی اور گاڑی چل پڑی۔ آدھا گھنٹے کا سفر تھا۔ اس

دوران وہ دوتین مرتبہ ڈاکٹر فرحان سے پوچھ چکی تھی۔

''آخر ہم جا کہاں رہے ہیں۔"

ڈاکٹر فرحان کی خاموشی اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ بالآخر کچھ مسافت طے ہوتے ہی وہ ایک عالیشان بنگلے کے سامنے پہنچ گئے۔ تو شہناز نے پوچھا۔

''یہ آپ مجھے کہاں لے آئے"۔

شہناز کو ابھی جواب بھی نہیں ملا تھا کہ تمام افراد خانہ اندر سے چلے آئے۔ اور نواب صاحب بھی اس جمگھٹے میں موجود تھے۔ وہ حیران سی ہوگئی۔

''اندر چلو بیٹی"

ڈاکٹر فرحان کی ماں نے پیار سے آواز دی۔ یہ نواب صاحب کے دُور کے رشتہ دار نکل آئے جو تقسیم ملک کی وجہ سے بچھڑ کر رہ گئے تھے۔ شہناز پر جونہی یہ حقیقت واشگاف ہوئی تو وہ آرام سے اس گھر میں رہنے لگی۔

ایک دن ڈاکٹر فرحان کمرے میں بیٹھے کچھ کہہ رہے تھے کہ شہناز اِدھر اُدھر تاک جھانک کرنے لگی۔ اُسکی نظریں میز پر پڑے گلدان پر پڑیں تو وہ کھو سی گئی۔ پھر پل بھر میں بولی۔

"یہ پھول بہت خوبصورت ہیں"۔

''ہاں۔ یہ پھول بہت خوبصورت ہیں مگر آپ سے زیادہ نہیں۔''

ڈاکٹر فرحان نے تعریف کے پل باندھنے شروع کئے۔ اور آہستہ آہستہ پیار کے جذبات دونوں کے دل میں مچلنے لگے۔ میل ملاپ بڑھنے لگا۔ تو بڑوں نے انکو رشتے کے بندھن میں باندھ دیا۔ اور سگائی کی تاریخ بھی طے ہوئی۔ نواب صاحب اپنے ملک واپس چلے گئے اور تیاریاں کرنے لگے۔

ملکی سطح پر امن کی جوت جگانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر فرحان اور

شہناز لوگوں اور سیاست دانوں سے مل رہے تھے۔ وہ سیمنار منعقد کروا رہے تھے اور ڈاکٹر فرحان ایک بڑے اجتماع سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

''میرے بھائیو! ہم انسان ہیں ہمیں امن اور چین سے رہنا چاہیے۔ اور نفرت کی دیوار جو دونوں ممالک کے درمیان حائل ہے گرا دینی چاہیے۔ اس قتل وغارت کو بند کر دینا چاہئے۔ اس بیچ لوگوں کے نعرے فضا میں بلند ہوئے۔

''قتل وغارت ۔۔۔ بند کرو۔ بند کرو۔''۔ ڈاکٹر فرحان نے اپنی تقریر جاری رکھی۔

''یہ شہناز خان ہے۔ جو پڑوسی ملک سے خیر سگالی کا پیغام لے کر آئی ہے۔ وہاں کی محبتیں لے کر آئی ہے۔ بھائیو! بے شک ہم نے الگ الگ گھر تعمیر کیے ہیں۔ یہ سرحدی لکیر کھینچی ہے۔ مگر وہاں ہمارے بھائی رہتے ہیں جو اس لکیر کی وجہ سے ہم سے دُور ہو گئے ہیں۔ ہمیں ان دُوریوں کو مٹا دینا چاہیئے۔''

''ضرور۔ ضرور'' کی آوازیں چاروں طرف گونج اُٹھیں۔

''بھائیو! جب نفرت اور انتشار پھیل جاتا ہے تو دل کا سکون چلا جاتا ہے۔ آؤ یہ عہد کر لیں کہ ہم امن چین سے رہیں گے۔''

اور اس مختصر سی تقریر کے بعد لوگ گھروں کو چلے گئے۔ ڈاکٹر فرحان ہر ایوان میں امن دوستی کے نعرے بلند کرتے رہے۔

اب ان کی سگائی میں کچھ ہی دن بچے تھے۔ اِدھر اُدھر تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سب خوش تھے۔ گھروں میں رونق اُمڈ آئی۔

اُس روز نواب صاحب اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بڑے تپاک سے سرحد پر استقبال کر رہے تھے۔ آر پار راستے کو سجایا گیا تھا۔ پھول بچھائے گئے تھے۔ گیٹ پر پھولوں کی مالائیں آویزاں تھیں وہاں تعینات فوجیوں میں مٹھائیاں بانٹی جا رہی

تھیں۔اتنے میں ڈاکٹر فرحان شہناز اور انکے رشتہ دار آپہنچے۔گیٹ کھولا گیا تو سب گلے مل گئے۔ایسا گمان ہو رہا تھا کہ دونوں ممالک ایک ہو گئے ہیں۔

پھر اچانک ہوا میں گولیاں چلیں۔سب لرز اُٹھے۔ایک فوجی گاڑی سے فوجی اُترے۔سٹریچر پر پڑی سر بُریدہ لاش جونہی زمین پر رکھ دی گئی۔تو برگیڈیر کی کرخت آواز ہوا میں گونج اُٹھی۔

''ڈاکٹر فرحان یہ تمہاری جاسوسی کا نتیجہ ہے تم دیش کے دشمن ہو۔''

اُس کی آنکھوں پر کالی پٹی باندھی گئی۔اور گاڑی میں بٹھا کر اُسے لے جایا جا رہا تھا کہ شہناز زور زور سے چلانے لگی۔

''برگیڈیر صاحب! جب جب امن آشتی کی بات ہوتی ہے تب نئے بکھیڑے کھڑے کیئے جاتے ہیں۔لاشیں بچھائی جاتی ہیں۔بے قصوروں کو سزا دی جاتی ہے۔ اب انتہا ہو چکی ہے۔خدارا! اب بس بھی کرو۔''

''شہناز میرا انتظار کرنا"۔

ڈاکٹر فرحان نے آواز دی۔

اور وہ دُور تک اُسکو دیکھتی رہی۔شہناز نے آسمان کی طرف نظریں اُٹھائیں اور ڈوبتے سورج سے نکلتی چھوٹی چھوٹی کرنوں کو دیکھ کر اُس کے دل میں مِلن کی اُمید جاگتی رہی۔



بول دوامّی

زرّیں کا بناؤ سنگھار جب بنائے نہ بنتا تھا تو خدشات سوچ کی رفعتوں کی ناکہ بندی کر کے لفظی معرکہ آرائی میں اُلجھانے لگتے اور وہ اناپ شناپ سوچتی۔ لیکن پھر وہ جلد ہی اس صورت حال سے نکل آتی۔

وہ سامنے آئینے پر نظریں جما دیتیں۔ اور زندگی کے حسین پل گھنٹوں بیٹھے بڑ بڑاتے گزارتی رہتی۔ وہ اکثر اپنے حُسن پر اتراتی رہتی۔

''ستواں ناک، گلابی ہونٹ، موتی جیسے چمکتے دانت اور نیلی نیلی آنکھیں نہ ہوتیں تو میں بری لگتی۔ مصوّر کائنات نے مجھے فرصت میں بنایا ہے۔''

پھر بیٹھے بیٹھے وہ اپنے بال سنوارنے لگتی۔ ان میں ربن باندھ دیتی۔ اپنے آپ کو خوب سجاتی۔ وہ پری جیسی لگتی۔ پھر پارک میں جا کر اپنی مُدھر اور سُریلی آواز میں گنگناتے لگتی تو نوشیں بیگم برہم ہو کر اُس کو خوب ڈانٹتی۔

''ہائے ہائے لڑکی۔ تم تو بے فکری میں تہذیب کی حدیں پار کرنے لگی ہو۔ چُپ ہو جاؤ۔ ابُو نے سُن لیا تو ناراض ہو جائیں گے۔ چپ ہو جاؤ لڑکی۔

''اوہو امی۔ یہ تو پروین شاکر کی نئی غزل ہے۔ میں تو گنگناؤں گی۔ آپ بھی نا!!"

''چپ ہو جاؤ۔ ورنہ۔۔۔۔۔۔۔"

''ورنہ کیا۔''

''میں آپکے ابّو کو بلاؤں گی۔"

''ابُو۔۔۔ابّو۔۔۔"زریں نے آواز دی۔

''مگر۔۔۔۔۔۔۔۔!ابُو تو ہے نہیں۔میری پیاری پیاری امّی۔"

نوشیین بیگم اس کو چپ کرانے کی کوشش کرتی تو وہ زور زور سے گنگنانے لگتی۔

''سات سمندر پار سے، گڑیوں کے بازار سے۔چھوٹی سی گڑیا لانا، ابّو جلدی آجانا۔"

وہ نوشیں بیگم کو خوب چڑاتی رہتی تھی۔جو تھک ہار کر دالان میں جا کر بیٹھ جاتی۔ اور سوچنے لگتی۔

''یہ کلی اتنی جلدی کھلِ اُٹھے گی۔یقین نہ تھا۔اب پنکھڑی ہو جائے گی۔اور ہم ۔۔۔۔۔!

وہ ان ہی سوچوں میں ہوتی کہ زریں اندر آ کر اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے لگتی۔ بچی کی یہ حرکتیں دیکھ کر ماں رونے لگتی تو زریں پاس آ کر اس کو پاگلوں کی طرح چوم کر بولتی۔

''امّی۔میں توبہ کرتی ہوں۔آئندہ کبھی گستاخی نہیں کروں گی"۔

پھر باتوں باتوں میں کہتی۔

''امّی یہ آنسو بہت قیمتی ہیں۔انھیں میری وداعی کے لئے بچا کے رکھو"۔

اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگتی۔خوب شرارتیں کرتی۔نوشیں بیگم تنگ آ کر جب کھسکنے کی کوشش کرتی تو زریں اُس کے ہاتھ پکڑ کر بولتی۔

''امّی چلو بیت بازی کھیلیں۔وہ اُس کی اُداسی دُور کرنے کی کوشش کرتی اور اُسکا من بہلانے کی مختلف تدبیریں سوچتی رہتی۔وہ اُسکو ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتی تھی۔

ایک دن زریں کمرے میں بیٹھی بناؤ سنگھار کر رہی تھی کہ اس سے آہٹ سنائی

دی۔ وہ چپکے سے نکل کر دالان کی طرف بڑھتے ہوئے امی کو کسی اجنبی سے کہتے سنتی۔

''نہیں نہیں۔ یہ بھی نہیں۔ یہ بھی نہیں۔ میری بیٹی چاند کا ٹکڑا ہے۔ بیاہ ہوگا جہاں ریشمی مخملی بچھونے ہوں۔ چاندی سے نہلائی سیڑھیاں ہوں اور نوکر چاکر ہوں۔ جہاں مہارانی کی طرح راج کرے گی اور لڑکا ایک گزٹیڈ آفیسر ہو"۔

''مگر یہ بے تکے شرائط ہیں۔'' درمیانہ دار نے کہا۔

''میری بیٹی بہت نیک اور خوبصورت ہے۔ لڑکا سندر شکیل ہو۔ تبھی بات چلے گی۔ تم کو منہ مانگی بخشش ملے گی۔"

درمیانہ دار کے جانے کے بعد زریں ہشاش بشاش کمرے میں لوٹی۔

اور من ہی من میں سوچتی رہی ۔

''شبھ گھڑی آئی ہے۔ ہاتھوں میں مہندی لگے گی۔ بیاہ ہوگا۔"

زریں کی آنکھوں میں بیاہ کے حسین سپنے آنے لگتے۔

''وہ چاق چوبند اور خوب صورت ہوگا۔'' ۔ پھر خود ہی کہتی۔

''اوہو زریں۔ یہ کیسا بکھیڑا لیکر بیٹھی ہو۔ یہ سوچنا بڑوں کا کام ہے۔ امّی ہے نا۔ وہ فیصلہ کرے گی۔"

نیل پالش کی بوتل اُٹھاتے ہی اس کی نظریں حنائی رنگ کے ایک سوٹ پر پڑیں۔ وہ کچن کی طرف لپکی۔ "تسلیم امّی جان" کہہ کر کچن کی الماریوں کی تلاشی لینے لگتی نوشین بیگم نے پوچھا ۔

''کیا ڈھونڈتی ہو۔"

وہ گنگناتی رہی۔

''ارے سنو تو سہی۔" وہ کچھ نہ بولی۔ اس پر نوشین بیگم آگ بگولہ ہوئی۔

''کیوں اتنا تنگ کرتی ہو۔ شرم نہیں آتی ہے۔"

''اوہوامی۔ کہاں چھپائی ہے۔''

''کیا''۔

''مہندی۔ ہاتھوں میں خارش ہو رہی ہے۔''

اس نے مہندی کا پاکٹ تھما دیا۔ اور زریں جا کر نگار بندی کرنے لگتی۔ اور سپنوں کے شہزادے کیلئے اپنے کنوارے دل کی وادی میں پھول سجانے لگتی۔

مگر۔۔۔ نوشین بیگم ایک ہی رٹ لگائے بیٹھی تھی۔ مُرغے کی ایک ہی ٹانگ۔ عورت ذات۔ کم فہم۔ کیا جانے کہ وقت ایک ایسا دھارا ہے جسکی جلترنگ میں ہم آہنگ ہونا ہی عقلمندی ہے۔ وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہتا ہے۔ اور اس کی نبض پہچان لینے والے ہی وقت شناس کہلاتے ہیں۔ اور وقت سے غافل لوگ فقط ہاتھ ملتے رہتے ہیں۔

نوشین بیگم نے کب وقت کی پرواہ کی۔ وہ چڑ چڑی ہوتی گئی اور خلیل صاحب دم بخود۔ رشتے کے انتخاب میں اختلاف بڑھتے گئے۔ وہ رُوبرو تھے کہ خلیل صاحب بولے۔

''بیگم۔ یہ بہت لائق رشتہ ہے۔ اب ہاں کردو۔''

وہ منھ بنا کر بولی۔

''یہ نان گزیٹیڈ ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ۔ بیگم ہماری بیٹی جوان ہوگئی ہے تمہارے کان پر جُوں نہیں رینگتی ہے تم ابھی بھی سیاہ سفید کرنے میں لگی ہو۔ اب اور انتظار کرنا مناسب نہیں ہے۔''

''بس بس۔ یہ لکچر بند کیجئے۔ میں سمجھوتہ نہیں کروں گی۔''

''لیکن بیگم۔ زریں کی عمر کا خیال کرو''۔

''ابھی جھولا جھولنے کی عمر ہے اسکی۔'' وہ بولی۔

''اوہوبیگم۔آپ سے بات کرنا ہی فضول ہے۔"

شب وروز گزرتے گئے۔اورزریںؔ عمر کی ارتقائی منزلیں بے فکری میں پُھلانگتی گئی۔اب اس کے ماتھے پر جھریاں صاف صاف دکھائی دیتیں اور ہاتھ بھی سکڑے سکڑے لگ رہے تھے وہ امی کی ہٹ دھرمی پر روتی رہتی۔

پھر ایک دن اچانک خلیل صاحب سخت بیمار پڑ گئے۔وہ درد سے تڑپتے رہے۔اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔آن کی آن میں صف ماتم بچھ گئی۔ماں بیٹی نے ریشمی مخملی اوڑھنیاں ریزہ ریزہ کیں جیسے دُھنیئے روئی دُھنتے ہیں۔

عرصہ بیت گیا تھا۔

اب یہ گھر اُلوؤں کی آماجگاہ لگ رہا تھا اور دیواروں پر تاریکی کی سیاہ زلفیں جُھول رہی تھیں کہ پھر ایک بار درمیانہ دار رشتہ لے کر آیا۔ماں بیٹی دالان میں موجود تھیں۔

''بی بی جی۔اب کے برابر کا رشتہ لایا ہوں۔مگر۔۔۔۔!

''مگر کیا"۔وہ بے تابی سے بولی۔

''وہ پہلے سے بیاہا ہے"

''بول دو امیؔ"

زریں پُرنم آنکھوں سے امّی کو تکتی رہی۔

☆☆☆

بدنصیب

بکھرے بال، پھٹا ڈوپٹہ، اُداس چہرہ۔ اُس کا پریشان حلیہ پاگلوں جیسا تھا۔۔ بے چاری پر مصیبت کا پہاڑ جو ٹوٹ پڑا تھا۔ دُکھ پر دُکھ بھرنا۔ شاید اُس کے مقدر میں ازل سے لکھا تھا۔ آس پڑوس کی عورتیں اس کے پیٹھ پیچھے عجیب عجیب باتیں کرتی رہتیں۔

''جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ کام ہی ایسے کئے ہونگے جبھی سیج چڑھتے ہی رانڈ ہوئی۔''

ایک نے شہ دی۔

''نہیں نہیں بہن شکل وصورت سے بُری نہیں لگتی۔ قسمت میں کھوٹ ہوگی اس لئے دو گھڑی کا سکون بھی نصیب نہ ہوا۔''

دوسری نے لقمہ دیا۔

''ویسے بھی اس شہر نا پرساں میں کون ایسا انسان ہے جس کو کچھ نہ کچھ جھیلنا نہ پڑا ہو''۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو''

یہ سب سہنے کے باوجود بھی وہ بدلتے حالات سے پریشان ہو جاتی۔

ہر سمت ایک نئی آواز اُبھری تھی۔ اور اس آواز پر جوان جوق در جوق لبیک کرتے نظر آرہے تھے۔ کارواں کے کارواں رواں دواں ہوئے۔ انجانی منزل کی طرف ۔۔ ان ہی حالات میں زیبا کا نورِ نظر یوسف صبح سویرے عمدہ سفید کپڑے زیب تن کئے ٹھاٹ سے نکلا تھا۔ ماں سے کہہ کر گیا۔

''میں شہر جا رہا ہوں''۔

شہر کے گلی کوچوں میں راہ بھٹک گیا ہوگا۔ وہ گھر نہیں لوٹا۔ زیبا کو فکر لاحق ہوئی۔
اُسنے ہمسائیگی میں یوسف کے دوستوں سے جا کر پوچھا۔
یوسف گھر نہیں لوٹا تمہیں کچھ بتا کے تو نہیں گیا۔"
ہر ایک کا جواب تھا۔
''آنٹی۔ نہیں تو۔''
اس کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ وہ رشتہ داروں کے دروازے کھٹکھٹاتی رہی۔ اُن سے پوچھتی۔
''یوسف یہاں آیا۔" جب اتہ پتہ نہ ملا تو مایوس ہو کر گھر لوٹ جاتی۔
زیبا کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ من ہی من میں سوچتی۔
''وہ کہاں ہوگا؟ کس حال میں ہوگا؟ زندہ ہوگا؟"
اُسے جب کوئی جواب نہ بن پڑتا تو اپنے بال نوچنے لگتی۔ اپنی تقدیر کو کوستی۔ اور بے بسی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھ کر چیختی چلاتی۔ ایسے لگتا جیسے کوئی کشتی کھینے والا مُنجدھار میں آ کر بے بسی کے راگ الاپنے لگا ہو۔ ابھی رشتہ ازدواج میں بندھے سال بھر بھی نہ ہوا تھا کہ ہر طرف حالات بگڑنے شروع ہوئے۔ بارود اُڑنے لگا۔ گھروں کے گھر جلنے لگے قدم قدم پر خوف کے سایے منڈلانے لگے۔ جینا دُوبھر ہو گیا۔ موت کی خبریں ہر طرف آنے لگیں۔
''یہ مر گیا۔ وہ مر گیا"
زیبا کا میاں بھی ایک بھیانک بم دھماکے کی زد میں آ کر اُسے داغ مفارقت دے گیا۔ اس وقت وہ میاں سے کچھ گز کی دُوری پر چل رہی تھی۔ یوسف بھی گود میں تھا۔ اُسنے میاں کو تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا۔ اور خون میں لت پت پڑی اس کی لاش

پر زار زار روتی رہی۔ زیبا کی بے وقت کی بیوگی نے سب کو خون کے آنسو رُلائے۔لوگ آ آکر ہمدردی جتاتے رہے۔

وقت گزرتا رہا۔ یوسف کی کلکاریاں زیبا کی ہمت بندھاتی رہیں۔اور وہ زندگی سے برابر لڑتی رہی۔ اُس ننھے سے فرشتے کے لئے۔ جسے اللہ نے اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ وہ سختیاں جھیلتی رہی لیکن یوسف کی پرورش میں کوئی کسر نہ اُٹھائے رکھی۔ ان ہی حالات میں اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ زیبا کی کل دنیا۔ یوسف۔ کئی دنوں سے گھر نہیں آیا۔ زیبا کی انکھیں اسکی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ترستی تھیں۔ اُس نے یوسف کو بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ سوچتی۔

''اب یوسف جوان ہوگیا ہے۔ اس کا بیاہ جلدی ہو جائے ۔تو اچھا ہے کیونکہ دن بدن حالات بگڑ رہے ہیں۔ ہر طرف مار دھاڑ، قتل و غارت گری ہو رہی ہے۔ اب یہ زمین بھی خون کی پیاسی ہوگئی ہے۔"

ایک دن دونوں برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کہ یوسف نے باتوں باتوں میں پوچھا۔

''اب لوگ روز روز مارے جاتے ہیں ایسا کیوں؟

زیبا کیسے سمجھاتی۔ اُس نے موت کو ایک فطری عمل قرار دیکر کہا۔

''موت اور گاہک کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ کبھی بھی آسکتے ہیں۔ اور ہاں۔ اللہ میاں نیک سیرت بندوں کو جلدی واپس بُلا لیتا ہے۔''

یوسف نے درد بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ماں۔ میرے پاپا بھی نیک سیرت تھے۔ تبھی اللہ میاں نے ان کو اتنی جلدی اپنے پاس بُلا لیا۔"

زیبا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی آنکھوں میں وہ وقت پھرنے لگا۔ وہ جب

میاں کے ساتھ کِھکھلا کر ہنستی رہتی۔ خوب صورت مقامات کی سیر کرتی۔ شکارے میں بیٹھ کر ڈل جھیل میں گھومنا ۔ وہ مستیاں۔

زیبا اب مرجھائی مرجھائی سی رہتی تھی۔ اُسکے دل کے زخم پوری طرح بھرے بھی نہ تھے کہ یوسف گھر سے چلا گیا۔ شاید وہ بھی اس کارواں سے جُڑ چکا تھا جونئی حدیں متعین کرنے نکلا تھا اب وہ گھر میں تنہا تنہا رہتی تھی اور گھر کی سُونی سونی دیواریں اسے کھائے جارہی تھیں۔ ایک روز سویرے پولیس تھانے کی راہ لی۔

''یوسف کہاں ہے۔ آج جواب لے کر ہی رہوں گی۔"

وہ خود سے بڑبڑاتی۔ تھانے پہنچ کر وہاں موجود آفیسر سے پوچھا۔

''یوسف کہاں ہے۔"

''ہم تلاش کر رہے ہیں۔ سراغ ملتے ہی آگاہ کر دیں گے۔'' اس نے کہا۔

ماں کا پیار اُبل پڑا۔ اُسنے آفیسر کے ٹیبل پر اپنی بند مٹھی مارتے ہوئے پوچھا۔"

''یہ ماں کب تک انتظار کرے گی۔ میرا کلیجا پھٹا جا رہا ہے۔ صاحب تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔'' اس بات پر آفیسر کو غصہ آیا۔ اور کرخت لہجے میں بولا۔

''یہاں آپ ہی کا لاڈلا گُم نہیں ہے۔ سینکڑوں جوان ماؤں سے بچھڑ گئے ہیں۔ ہم نے یوسف کا نام گمشدہ افراد کی فہرست میں درج کر دیا ہے۔ ابھی تم جاؤ یہاں سے۔"

زیبا آفیسر کے سامنے گڑگڑاتی رہی۔

''یوسف کے سوا اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ خدا کے واسطے! میرے لختِ جگر کو ڈھونڈ لاؤ"۔

آفیسر نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ زیبا نامراد تھانے سے نکل کر بھرے بازار میں پاگلوں کی طرح راہ گیروں سے پوچھتی رہی۔"

تم نے میرے یوسف کو تو نہیں دیکھا"۔

سب نفی میں سر ہلا کر اس کی باتوں کی ان سنی کرتے نکل جاتے تھے۔ایک عورت سے روتے روتے بولی۔

''تم نے کسی گورے چٹے جوان کو دیکھا۔میرے یوسف کو دیکھا"۔

''نہیں بہن" کہہ کر وہ چلی گئی۔

زیبا پاگلوں کی طرح دیر تک ہر راہ گیر کے پیچھے بھاگتی رہی۔

''ارے بھائی۔میرے یوسف کو کہیں دیکھا ہے۔ہے بہن۔تم نے دیکھا۔''

لوگ چپ سادھ لینے کو ہی ترجیح دیتے تھے بازار بھیڑ میں ایک درویش نمودار ہو کر اللہ ھو اللہ ھو کرنے لگا۔زیبا اس کی طرف لپک کر بولی۔

''بابا۔میرا بیٹا غائب ہے"۔

''اُدھر وہ سنسان جگہیں دیکھتی ہو۔اُسنے انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔

''وہاں ایک شہر زیر زمین آباد ہے۔وہیں گُم نام قبریں بھی ہیں۔جن میں ماؤں کے لال سو رہے ہیں"۔زیبا بالوں کو نوچتے نوچتے چلاتی رہی۔

''بابا۔ایسا مت کہو۔وہ میرے جینے کا واحد سہارا ہے"۔

آس پاس لوگ دانتوں تلے انگلی دابے دیکھ رہے تھے"

ارے ظالمو! کوئی تو بتاؤ۔میرا یوسف کہاں ہے؟"

بھیڑ میں کسی نے آواز دی۔

''شاید پاگل ہے۔''

''میں پاگل نہیں ہوں۔میں ایک ماں ہوں۔ایک بدنصیب ماں۔''

اور وہ یوسف۔۔۔یوسف چلاتے اُس ویرانے کی طرف نکل پڑی۔جس کی طرف بابا نے اشارہ کیا تھا۔

☆☆☆

لاش

''اُس احاطے میں ایک لاش پڑی ہے۔''

''لاش! کس کی لاش'' ماجد نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

''بے چارہ۔۔۔بے رحمی سے مارا گیا ہے''۔

''مارا گیا ہے۔کون''۔اُس نے پھر پوچھا۔

نزدیکی پولیس چوکی پر مامُور محافظ پھرا یکدم چُپ ہو گیا ماجد تذبذب میں پڑ گیا۔ اور محافظ کے سامنے چلانے لگا۔

''لاش۔۔۔۔لاش۔۔۔۔لاش''

اس کی چیخیں آس پاس کے ہر فرد نے سُن لیں۔لوگ جمع ہو گئے۔ دیکھتے ہی اُدھم مچ اُٹھا۔ اتنے میں پولس کی ایک ٹولی آ پہنچی۔۔لوگ تتر بتر ہو کر گرتے سنبھلتے رہے۔

''ہی۔۔۔۔ہا۔۔۔ہُو۔۔۔''

ڈرانے والی آوازیں گونجنے لگیں۔لوگ غائب ہو گئے۔ ویسے ہی جیسے صبح کے آنے پر رات کے ٹمٹماتے تارے غائب ہو جاتے ہیں۔مگر اس بھاگ دوڑ میں کچھ جوان پکڑے گئے۔

''اردلی سب کو لائن حاضر کر دو۔'' پولیس آفیسر نے کرخت لہجے میں حکم دیا۔

''ایک دو۔۔۔۔۔ایک دو۔۔۔۔۔ ویشرام۔۔۔ساودن۔۔۔'' کر کے

سب لائن حاضر ہو گئے۔

''جوانو! اس علاقے کو گھیرے میں لے لو"۔

''یس سر" "لفٹ رائٹ۔۔۔لفٹ رائٹ" آناً فاناً حکم کی تعمیل ہوئی۔

''اردلی جولڑ کے پکڑے گئے ہیں۔اُن کو پوچھ تاچھ کے لئے تھانے لے چلو۔"

''یس سر"

''ہاں۔تم بتاؤ۔گولی کس نے چلائی"۔

''معلوم نہیں صاحب" پولیس آفیسر نے ایک ایک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''تم۔۔۔تم۔۔۔تم نے چلائی۔"

جواب ندارد۔ ہر ایک نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''سانپ سونگھ گیا ہے کیا۔جواب دو۔

ان کی چپ سادھنے پر وہ بھڑک اُٹھا۔اُسنے سپاہی کو بُلا کر کہا۔

''سپاہی۔۔۔۔ڈنڈا لے آو۔"

اور ان کی خوب پٹائی کی۔چیخنے چلانے کی آوازیں دُور تک سنائی دیتی تھیں۔

''تم بتاو۔لوگوں کو کس نے اکھٹے کیا"۔

''وہ۔۔۔۔سر۔۔ماجد۔۔"ایک لڑکے نے چپکے سے کہا

''سپاہی دروازے پر تالا چڑھا دو۔"

''یس سر"۔اور وہ آفس میں چلے گئے۔

''سپاہی۔کس کا نام لیا اُسنے"۔

''سر۔۔کوئی ماجد ہے۔"

''گاڑی لے آو۔" اُسنے حکم دیا۔پھر اپنے ماتحت پولیس کی ایک ٹولی کو ہدایت دی۔

"سپاہیو۔ جس کسی نے بھی جُرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اُس کو پکڑنا ہے۔ زندہ یا

۔۔۔۔۔۔"

''یس سر"

وہ بستی میں داخل ہو گئے۔ اور ایک مکان کے دروازے کو کھٹکھٹایا۔

''دروازہ کھولو۔'' انھوں نے یک زبان ہو کر آواز دی۔

کچھ توقف کے بعد ایک بزرگ نے دروازہ کھولا۔ سپاہی اندر گھس گئے۔

''ہی۔۔۔۔۔ہاَ۔۔۔ہُو"

اندر خاموشی چھا گئی۔ اور وہ گھر کے جوان بیٹے کو باہر آنگن میں لے آئے۔ پھر اُس پر جھپٹ پڑے۔

''بولو۔ گولی کس نے چلائی۔" وہ زاروقطار روتے بلکتے بولا۔

''صاحب! مجھے معلوم نہیں"

''تم ایسے نہیں بولو گے"۔

سپاہی نے ڈنڈے سے مارنا شروع کیا۔

''آ۔۔۔۔آ۔۔۔۔آ" وہ پٹتے پٹتے چلاتا رہا۔ ممتا کی دیوی۔ ماں۔ ممتا نے جوش کھایا۔ اُسنے آکر سپاہی کے ڈنڈے کو پکڑا۔

''چھوڑو کمینے۔ کیوں مارتے ہو۔"

اور سپاہی سے دو دو ہاتھ کر کے بیٹے کو چھڑا لیا۔

کرفیو کا سا سماں تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سپاہی گھر گھر تلاشی لینے لگے۔

''ہے۔ بھاگو مت کارڈ دکھاو"۔

سپاہی نے آواز دی۔ اُس جوان کی حالت بے جان بت کی سی ہو گئی۔

''جناب'' اُس نے کارڈ پیش کیا۔
''کیا نام ہے''۔
''جناب کارڈ پر لکھا ہے''۔
''کارڈ پر لکھا ہے۔تم اپنا نام نہیں جانتے۔آنکھیں دکھاتا ہے''۔
''نہیں جناب! میری کیا اوقات۔ میں ایک غلام ہوں۔ روٹی روزی کے لئے محتاج ہوں''۔
دو چار گھونسے مار کر سپاہی نے کہا۔
''بھاگو۔۔۔مُڑ کر نہ دیکھنا''۔
بے چارے کو جان کے لالے پڑ گئے۔ آنکھ جھپکتے ہی اوجھل ہو گیا۔اسی اثنا میں ایک آدمی آکر پوچھنے لگا۔
''جناب! آپ کس کی تلاش میں ہیں''۔
''لو جی۔ بتا دو۔اُس کی تلاش ہے۔ وہ۔ وہاں۔ اُس احاطے میں گولیوں سے چھلنی ایک لاش پڑی ہے۔تم نے مارا ہے''
''نہیں صاحب'' وہ ہکلاتے ہکلاتے بولا۔
''تم نے گولی چلائی۔ بندوق کہاں رکھی ہے۔ لے چلو تھانے۔تفتیش میں بتا دے گا''۔
''صاحب مجھے چھوڑ دو۔میں بے گناہ ہوں۔میں نے کوئی گولی نہیں چلائی۔''
وہ منتیں کرنے لگا۔ ''
''کس نے چلائی''۔
''مجھے معلوم نہیں''۔
''چلو! اُٹھا بیٹھی کرو۔ بھاگنا مت۔ہم لوٹ آئیں گے''۔

''ایک ۔۔۔۔دو"۔اور وہ دیر تک یہ مشق کرتا رہا۔سپاہی دوسرے مکان کے آنگن میں وارد ہوگئے۔

''ہاتھ اُوپر کرو"۔" گھر کا نوکر گلی کی ایک دُکان سے اشیائے خوردنی لے کر آرہا تھا۔اُس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ایک سپاہی لپک کر گیا۔

''بہرہ ہے کیا؟

''ہاتھ اُوپر کرو"۔وہ ڈر کے مارے جوں ہی ہاتھ اُٹھانے لگا۔

''ٹھپ ۔۔ٹھپ۔۔۔ٹھپ" ہاتھ میں پالیتھین کے لفافے پھٹ گئے اور ٹماٹر،بینگن،آلو زمین پر بکھر کر رقص کرنے لگے۔سپاہی ٹھٹھک کے رہ گیا۔

''فرن اُوپر کرو۔" آہا۔پالیتھین کے لفافے استعمال کرتے ہو تجھے معلوم نہیں کہ سرکار نے انکے استعمال پر پابندی لگادی ہے۔ان سے ماحول میں آلودگی پیدا ہو جاتی ہے۔" سپاہی نے کہا۔

'' صاحب معاف کردو۔آئندہ غلطی نہیں کروں گا۔''

اندر سے ایک عورت دوڑتے دوڑتے آئی۔ وہ سبزی جمع کرنے لگی۔ اور سپاہیوں کو صلوٰتیں سنانے لگی۔ ایک سپاہی کو غصّہ آیا۔اُسنے نوکر کو دو چار ڈنڈے مارے اور پوچھا۔"

''بتاو۔ماجد کا گھر کہاں ہے"

''ماجد۔کون ماجد۔''

''انجان مت بنو۔جلدی بتاو؟نہیں تو۔چلنے کی حالت میں نہیں چھوڑوں گا۔''

عورت کے تیور بگڑ گئے۔اُسنے ڈنڈے کو پکڑ کر کہا۔

''ہم کسی ماجد کو نہیں جانتے ہیں"۔

''نرا جھوٹ۔''

اُس نے ساتھ والے مکان کی کھڑکی پر موجود عورت سے کہا۔

''بھا جی۔۔۔ یہ ماجد کو ڈھونڈتے ہیں"۔

آس پڑوس میں خبر پھیل گئی۔ ماجد کی ماں سینہ کوبی کرتے باہر آگئی۔ اور بیٹے کو کھڑے کھڑے بُرا بھلا کہنے لگی۔

''ارے کم بخت۔ میں کہتی تھی نا۔ ان آوارہ لڑکوں کی صحبت سے دُور رہو۔ پڑھائی میں من لگاو۔ مگر تم ایک نہ مانے۔''

دو چار چانٹے رسید کیئے۔ کہا۔

''بھاگو"

''مگر ماں۔ میرا قصور'' اُسنے پوچھا۔

''ارے بیٹے۔ یہاں اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔ یہاں خطا نہیں دیکھتے۔

''بھاگو"

اور اُسنے بھاگنا شروع کیا۔ پولیس کو جب کوئی سراغ نہیں ملا۔ تو آفیسر نے مزید سپاہی بُلانے کا حکم دیا۔ آن کی آن میں سینکڑوں سپاہی آدھمکے۔

''سپاہیو۔''"

''یس سر"

سارے علاقے کو گھیرے میں لے لو۔ اور لوگوں کو اسکول کے احاطے میں جمع کردو۔ ہم شناختی پریڈ کریں گے۔ قاتل کو پکڑنا ہے۔ ہوم منسٹری سے دباو بڑھ رہا ہے اضافی سپاہی ڈیوٹی پر چلے گئے۔ ایک نوجوان کھڑکی کھول کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سپاہیوں نے آواز دی۔

''نیچے آوَ۔"

وہ نیچے آگیا۔ سپاہیوں نے کچھ مکے مارے اور پوچھا۔

''ماجد کو جانتے ہو۔"

''نہیں صاحب"

''ایسے نہیں بتائے گا۔ "

سپاہی کمرے میں لے چلو۔ آفیسر نے کہا۔ بے چارے کی مار پٹائی ہوئی۔

''چلو۔ مسجد میں جا کر اعلان کرو۔ کریک ڈاون ہے۔''

اُسنے اعلان کر دیا۔ لوگ گھروں سے نکلنے شروع ہوئے۔ اُس نوجوان کو ساتھ لے گئے اور گاڑی میں بٹھا دیا۔

''دیکھو۔ ماجد کی ٹھیک ٹھیک پہچان کرنا۔ اگر گڑبڑی کی تو پھر تمہاری خیر نہیں۔''

لوگ جمع ہو گئے۔ ان کے چہروں سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں سہمے سہمے لگ رہے تھے۔ سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ اور ایک ایک کی پہچان ہونے لگی۔ اسی دوران گھروں سے شور و غل مچ گیا۔

''ہے۔ رک جاؤ۔"

سپاہی آواز دے رہا تھا۔ ماجد جنگل کی اور بھاگ رہا تھا اور کچھ سپاہی اسکے تعاقب میں دوڑے جا رہے تھے۔

''سر یہ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے"۔

ایک سپاہی نے دوڑتے آواز دی۔

''گولی چلاؤ۔''

آفیسر نے حکم دیا۔ سپاہی رُک گیا۔ بندوق چھتیانے لگا۔

''رک جاؤ۔ رک جاؤ۔" ماجد رُک نہیں رہا تھا۔

''ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ ٹھک۔'' وہ ہوا میں گولیاں داغنے لگا۔

''سپاہیو۔ آگے بڑھو۔" آفیسر نے آواز دی۔ وہ ماجد کا پیچھا کرتے رہے۔

گولیوں کی آواز سُنکر لوگ پریشان ہوگئے۔ ماجد کا باپ پولیس آفیسر کے پاس آکر پوچھنے لگا۔

''صاحب گولیاں چل رہی ہیں۔ کیا ماجرا ہے"۔

''قاتل کا سراغ مل گیا۔ وہ اس وقت جنگل کی طرف بھاگ رہا ہے۔ ابھی پکڑا ۔یا۔۔۔ماجد نام ہے۔''

آفیسر نے کہا۔

یہ سنتے ہی وہ چلانے لگا۔

''صاحب ماجد قاتل نہیں ہے۔ وہ بے گناہ ہے۔''

اور زمین پر پاؤں پسارے گڑ گڑانے لگا۔

"صاحب وہ میرا بیٹا ہے۔ اُس کو بچالو۔ اُسنے کسی کا قتل نہیں کیا ہے۔"

''قتل نہیں کیا ہے'' پولیس آفیسر نے دو تین لاتیں مار کر کہا۔

پھر سپاہیوں کو حکم دیا۔" لے جاؤ اسکو۔ جب تک قاتل ہاتھ نہیں لگتا۔ بند رکھو۔" سپاہی مکی لات کرتے اس کو اندر لے گئے۔ لوگ بے بس دیکھتے رہے۔ ان کی زبانیں جیسے حلق میں اٹک گئیں ہوں۔ اُدھر ماجد بھاگتے بھاگتے جنگل کے نزدیک پہنچ گیا اور اُس گھنے جنگل میں چھپنے ہی والا تھا کہ وہاں موجود پولیس آفیسر نے سپاہیوں کو پھر حکم دیا۔

''گولی چلاؤ۔" سپاہیوں نے بے تحاشا گولیاں چلائیں۔ اور گولیوں کی گھن گرج سے سارا جنگل لرز اُٹھا۔ چیل کوے چی چی کائیں کائیں کرتے کرتے اُڑ گئے۔ بھالو، شیر، لکڑ بھگے اپنی پناہ گاہوں میں چُھپ گئے۔ مور سہم کر نیولے کے بل میں گھسنے کی کوشش کرتا رہا۔ ماجد کے جسم پر پے در پے گولیاں لگیں وہ دھڑام سے گر گیا اور برف کے تودے کی طرح نشیبی زمین سے لڑھک کر نیچے آ گیا۔ اور زمین خون سے لال

ہوگئی۔

''سپاہیو۔لاش لے آؤ۔"

پولیس آفیسر نے حکم دیا اور تھوڑی ہی دیر میں پولیس والے لاش کو لے کر اسکول کے احاطے میں پہنچ گئے۔خون میں لت پت لاش کو دیکھ کر لوگ زاروقطار رونے لگے۔

''ارے ظالمو۔تم کو رحم نہیں آیا۔میرے بیٹے کو مار ڈالا"۔

ماجد کا باپ دوڑتے دوڑتے آیا۔اور بیٹے کی لاش سے لیٹ کر پاگلوں کی طرح اُسے چُومنے لگا۔پھر وہ بے قابو سا ہوگیا۔

''ارے کمینو! میرے بیٹے نے کس کا قتل کیا ہے۔کوئی بتاؤ تو سہی۔''

وہ روتا رہا۔اُس کی آنکھوں سے جیسے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی ہو۔

''ہے آفیسر۔تم بولتے کیوں نہیں۔کس کا قتل کیا ہے میرے بیٹے نے۔''

اُسنے آفیسر کا گریبان پکڑ لیا۔لیکن جلد ہی سپاہیوں نے اُسکو قابو میں کر لیا۔

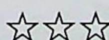
پولیس آفیسر نے مکھیا کو بُلا کر کہا۔

''اس کو ساتھ لے آؤ۔"

اور وہ اس احاطے کی طرف چل پڑے جہاں لاش پڑی تھی۔

''وہ رہی لاش"۔

پولیس آفیسر نے کہا۔اور دیکھ کر سب ہکا بکا ہو کر رہ گئے وہاں ایک لاش پڑی تھی جس کے جسم سے کھال غائب تھی۔



بے چاری

دہشت ان کے دلوں میں سما گئی تھی۔ وہ بڑی ہوشیاری سے اسکی حرکات وسکنات دیکھ رہے تھے۔ ایک طویل القامت جانور۔ جسکے جسم کی ایک جنبش پر لوگ استغفار پڑھتے تھے۔ اپنے آنگن کے دروازے پھرتی سے جا کر یکبارگی بند کر دیتے اور پٹ پر کنڈی چڑھا کر دُعا کرتے۔

''یا اللہ! ہماری گلی کو اس کے سایے سے دُور رکھنا۔''

وہ اندر ہی اندر دم بخود ہو رہے تھے۔ لوگوں کی اضطراری حالت دیکھکر میں دُبدُھے میں پڑ گیا۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا۔ جو عالیشان ملبوسات زیب تن کئے لاچار آنگن کے صدر دروازے پر کھڑے تھے۔

''یہ لوگ اتنے ڈرے سہمے کیوں ہیں۔ کیا ماجرا ہے؟"

اُسنے ایک خلوت گاہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''وہ جانور"۔

''جانور"

میں حیرت میں پڑ گیا۔ میں نے استفسار کیا۔ اُسکی زبان جیسے حلق سے اتری۔ وہ بے جان بت کی طرح زبان بریدہ ہو گئے۔ اُس لہلہاتے خلوت گاہ میں ایک چوپایہ مزے سے گھاس چر رہا تھا۔

''گھاس چَرنے والے جانور شریف النفس ہوتے ہیں"

میں نے سوچا۔"

''پھر۔۔۔۔ یہ لوگ کیوں اس سے ڈرتے ہیں۔"

میں نے اس جانور کو تاڑنے کی کوشش کی۔ مگر پہلی بار بصارت کی کمزوری کے احساس نے ذہن میں انگڑائی لی۔ اور نظروں میں غبار چھا جانے کے سبب میں اسکی پہچان نہ کرسکا۔۔"

''ہونہ ہو۔ یہ ضرور کوئی جنگلی جانور ہے۔ جو شاید انسانی ماس کا بھی شیدائی ہے۔ مگر۔۔۔۔ تب تو لوگ اسکو بھگا دیتے یا مار ہی ڈالتے۔ پھر۔۔۔۔ یہ لوگ اپنے صدر دروازوں پر ہٹے کٹے اردلیوں کی طرح کیوں چوکنا رہتے ہیں۔"

صاحب کے ماتھے سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ وہ حیرت زدہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا

''ہاں صاحب۔ آپ اُس جانور کی بات کرر ہے تھے۔ بڑا سا کالا سا۔ یہ تو ریچھ لگتا ہے۔"

میں بات بات میں موتی پرو کر اُسکو پھُسلانے لگا۔ وہ بڑے جتن کے بعد بول اُٹھے۔

''آپ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں کیا؟"

''نہیں۔۔۔۔ ایسا تو بالکل نہیں ہے۔ آپ بڑے ہوشیار اور دانا لگتے ہیں۔ میں بس اس دہشت کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔ آپ یوں ہی خفا ہو رہے ہو۔"

اُسنے نتھنوں اور ماتھے میں کھنچاؤ لا کر کہا۔

" کیوں انجان بنتے ہیں آپ۔ یہ چوپایہ ہے۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔"

''ہاں ہاں۔ یہ چوپایہ دکھتا ہے۔ مگر۔۔۔۔۔ لوگ اس سے خوف زدہ کیوں ہیں؟''

وہ سوچوں کے سمندر میں ڈوب گیا اور مجھ سے نظریں چُرانے کی تاک میں لگ رہا تھا۔ میں نے اسکا من لبھانے کی کوشش کی۔

’’چھوڑیئے صاحب! اس چوپایہ کو۔ آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔‘‘ بس اتنی سی بات پر وہ آگ بگولہ ہو گئے۔"

’’ارے جناب! یہ میرا علاقہ ہے۔ میرے مکان کے سامنے آپ کھڑے ہیں۔ آپ مکین سے سوال کرتے ہو۔ واہ۔ کیا سینہ زوری ہے۔ ارے جناب! جاو اپنا راستہ لو۔‘‘

میں نے بات کو طول دیکر اسے کہا۔

’’ارے صاحب! اپنی گلی میں ہر ایک شیر ہوتا ہے۔ کبھی باہر کی دنیا گھومے پھرے ہو کہ نہیں۔"

میں نے سوچا۔ یہ طیش میں آ کر کچھ اُگل دیں گے۔ پل بھر کے تامل کے بعد اُسنے غصہ تھوکتے ہوئے کہا۔

’’ارے جناب! اس علاقے میں پہلی بار آئے ہو کیا؟۔"

’’ہاں صاحب ذرہ بھر خیال آتا کہ یہاں مہمانوں کے ساتھ لوگ اس طرح پیش آتے ہیں۔ تو کبھی مُنہ نہ دکھاتے۔ اتنی بڑی حویلی دیکھکر سوچا تھا کہ کوئی نواب ہے۔ لیکن۔۔۔ سب اُلٹ پُلٹ ہو رہا ہے۔‘‘

وہ مشکوک نظروں سے مجھے تکتے رہے۔ خفیف سی خاموشی کے بعد میں نے اسے کہا۔

’’چلئے صاحب! آپ پوچھنا مناسب نہیں سمجھتے ہو۔ میں تعارف کرائے دیتا ہوں۔"

اتنی سے بات ہوئی۔ کہ ایک تیز رفتار جیپ ہوا میں گرد اُڑائے سامنے سے ہو کر گزر گئی۔ ہمارے لباس پر گرد کی پرت سی جم گئی اور بُشرے بے رونق ہو گئے۔ میں آنکھیں موند ھنے لگا۔ اور گفتگو کا موضوع بدلتے پوچھا۔

’’ ارے صاحب! یہ پولیس جیپ گشت کیوں کر رہی ہے۔ کوئی چوری چکاری

ہوئی ہے کیا؟"

اُسکا ماتھا ٹھنکا۔ وہ سوچنے لگے۔

" شاید۔ جاسوس ہے۔ تبھی باریک بینی سے جانچ کر رہا ہے۔"

" ارے صاحب؟ آپ گونگے کی طرح چپ ہیں۔ یہ پولیس کیا پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ کن کی متلاشی ہے۔ کسی کا قتل ہوا ہے۔ اور قاتل۔۔۔۔ کون ہے۔"

"بس۔۔۔۔۔ اُسکے ماتھے سے پسینہ چھوٹنے لگا۔ اپنا رومال بڑھا کر بولے۔

"آپ اپنا چہرہ صاف کر لیجئے۔ میں بس آیا۔"

کچھ توقف کے بعد وہ آ کر بولے۔

" ارے جناب! یہ دیکھئے۔ سڑک کی حالت کتنی خستہ ہو چکی ہے۔ کئی مرتبہ منسٹر صاحب کے پاس وفد لیکر گئے تھے۔ اور تارکول بجری بچھانے کی درخواست کی تھی۔ لیکن۔۔۔۔۔ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ الیکشن میں بھیگی بلی بن کر کوچہ کوچہ ووٹ کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ اور مطلب بر آتے ہی پُھر ہو جاتے ہیں۔"

"ارے صاحب! یہ اپنے نجی مسائل سے ہی کب فارغ ہو جاتے ہیں۔ پھر۔۔۔۔ عزیز و اقارب۔ انکی نوکریاں۔ یہ تھوڑے ہی لوگوں کے غمخوار ہیں۔ جو سڑکیں مرمت کرائیں، بجلی اور پانی فراہم کرائیں۔ انکی اپنی کالونیاں جگمگاتی رہنی چاہیں۔ لوگ جائیں بھاڑ میں۔ انھیں کیا غم؟۔ خیر چھوڑیئے صاحب۔ جس کے دل میں رحم نہیں وہ قصائی ہے۔"

ایک طویل بات چیت کے بعد اُسکو خاطر تواضع کی سوجھی۔ اور بولے۔"

"ارے جناب! آپ اندر تو آیئے۔" میں اسکے ہمراہ چلا گیا۔ آنگن کی سرسبز پارک میں قرینے سے کرسیاں میز لگے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد نوکر چائے لیکر آیا۔ اور یہ بولے۔

" اچھا جناب! اب بتا دیجئے۔اس علاقے میں کیسے آنا ہوا۔"

" ارے صاحب! میں یہاں کی جھیل پر ایک جانور کی کھوج میں آیا ہوں۔ مگر۔۔۔لگتا ہے۔ یہاں رات کی خاموشیوں نے دن کی رونق پر دھاوا بول دیا ہے۔ جہاں تک نظر جاتی ہے۔لوگ پریشانی کے عالم میں افسردہ گیت الاپتے دروازوں پر سفیدے کی طرح استادہ نظر آرہے ہیں۔فضا میں بھی سنسناہٹ ہے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کم سنائی دیتی ہے۔آخر بات کیا ہے؟"

وہ اس بارے میں کچھ نہیں بول رہے تھے۔ مجھے لگا۔اس کے دل و دماغ کو کسی مافوق الفطرت عُنصر نے قبضے میں کر رکھا ہے۔میں کرید کرید کر پوچھتا رہا۔۔مگر سب لاحاصل ثابت ہو رہا تھا میں نے حقیقت جاننے کی سوچی۔ میں بڑی چستی سے صحن سے باہر چلا گیا۔اور اس خلوت گاہ کی طرف کھیت کھلیانوں سے گزرتی پگڈنڈی پر قدم بڑھانے لگا۔گرتے سنبھلتے کچھ مسافت طے کر چکا تھا کہ اس نے آواز دی۔

" ارے جناب! لوٹ آیئے۔ ورنہ خطرے میں پڑ جاؤ گے۔"

میں نے تند لہجے میں کہا۔

"میں ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ میں بزدل نہیں ہوں۔"

میں نے ٹھہر کر ارد گرد نظر دوڑائی تو لوگ ہکا بکا دیکھ رہے تھے۔اُسنے واپس آنے کے لئے پھر اصرار کیا۔

" ارے صاحب! آخر آپ کا دل پسیج ہی گیا"۔

میں واپس چلا گیا۔اور کہا۔

"اچھا بولئے۔یہ کونسا جانور ہے۔"

وہ تذبذب کے دائرے میں بدستور جھگڑے رہے۔ میں نے اسکی دل جمعی کرتے کہا۔

''میں ایک ریسرچ اسکالر ہوں۔"

آخراُسکا دل پگھل گیا۔

'' جناب! یہ جانور نہیں بلا ہے بَلا"۔"

''بلا "

''ہاں ہاں بَلا۔اس نے لوگوں کا جینا دُوبھر کیا ہے۔کیا بتاؤں۔اس منحوس کے قدم پڑتے ہی کیا ہوا"۔

''کیا ہوا۔" میں نے پوچھا۔

''قتل۔۔۔۔ایک نہیں۔۔۔۔چار قتل ہوئے۔اور ہاں موقع ورادات پر سرپنچ صاحب موجود پائے گئے تھے۔نئے نئے سیاسی اُفق پر نمودار ہوئے تھے۔بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے جی رہے تھے۔ویسے جناب ان سرپنچ لوگوں کی چال ڈھال ہی بدل گئی ہے۔یہ خود کو سر بہ فلک قد سمجھنے لگے ہیں۔گاؤں کو اپنی جاگیر۔اب لوگ منسٹروں کی کوٹھیوں کی راہ بھول گئے ہیں۔اب ان ہی کے گھروں میں عوامی دربار لگتے ہیں۔ویسے بھی حکومت کے تانے بانے ڈھیلے پڑے ہیں۔چپراسی سے لیکر آفیسر تک سب حاکم بنے بیٹھے ہیں۔

''اندھیر نگری چوپٹ راج والی بات سمجھ لیجئے۔سرپنچ صاحب کو پوچھ گچھ کے لئے لے گئے تھے۔تب سے کھوئے کھوئے سے لگ رہے ہیں۔اب ہیکڑی جتانے کا انداز بھی بھول گئے ہیں۔سچ ہے جناب! جس تن لاگے وہ تن جانے۔اچھا۔آپ میرے نوکر کو جھیل تک ساتھ لے جایئے۔کام آسان ہو جائے گا۔''

'' بات پھر وہیں آکر اٹک گئی۔میرے تجسس کی حدیں بے کراں سی ہونے لگیں۔میں سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر اُس جانور کے بارے میں پھر سوچنے لگا۔میں نے مزید استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔

''ارے صاحب! یہاں گھروں سے چوپایوں کی آواز تک سنائی نہیں دیتی ہے۔''

''ارے جناب! لوگوں کو خدشہ ہے کہیں یہ جانور ہمارے چوپایوں سے گھل مِل کر دوستی نہ کر لے اور اپنا گھر آباد کرنے کی نہ سوچے۔ تو خواہ مخواہ مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ اس کے سبب چوپایے ٹکے ٹکے بک گئے۔ قصائیوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ تمام مویشی خانے خالی اور ویران پڑے ہیں۔''

''۔مگر کیوں؟"

''ارے جناب! جس دن یہ جانور اس علاقے میں داخل ہوا۔ تبھی سے پولیس نے جاسوس گلی گلی میں پھیلائے ہیں تاکہ اس کے مالک کو ڈھونڈ نکالیں جو روپوش ہے۔ اس جانور کا نام تک کوئی زبان پر لانے کی جرات نہیں کرتا ہے۔ پچھلے جنم کا پاپی رہا ہوگا۔ اپنی عافیت چاہتے ہو تو اس جھنجٹ سے دُور ہی رہو۔"

کچھ معتبر اور باریش آدمی دروازے پر دستک دیتے ہی اندر داخل ہو گئے۔ ان کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ اور پریشانیوں میں ڈوبے لگ رہے تھے۔ انہوں نے سرگوشی کرتے ہوئے صاحب سے کچھ کہا۔ اور صاحب نے بند مٹھی ان کی طرف کی۔ وہ جانے لگے تو میں نے پوچھا۔

'' آپ اُس جانور سے اتنے خوف زدہ کیوں ہیں۔ وہ کوئی تیندوا تو نہیں جو گھر میں گھس کر نقصان پہنچا دے۔ وہ تو کب سے گھاس چر رہا ہے۔''

'' جناب دُعا کیجئے۔ یہ بلا اس علاقے سے چلی جائے۔"

یہ کہہ کر وہ ایک دم چلے گئے۔ میں نے صاحب کے چہرے پر ملتجی نظریں دوڑائیں۔ وہ میری سراسیمگی بھانپ کر بولے۔

'' ارے جناب! اب آپ سے کیسا تکلف۔ یہ چندہ جمع کر رہے ہیں۔ کل سویرے پیر صاحب کی درگاہ پر ایک چوپایہ نذر چڑھایا جائے گا۔ اور مرد و زن جمع ہو کر

دُعا کریں گے۔اغلب ہے کہ اللہ جل شانہ دُعا قبول فرمائے اور یہ بلا ٹل جائے۔''

سورج ڈوب چکا تھا اندھیرے آہستہ آہستہ روشنی پر پہرے ڈال رہے تھے۔ ہر سو پرندے گھونسلوں کی طرف پرواز کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ آسمان کی وسعتوں میں تاروں کی چھاؤں کا منظر عیاں ہونے کو تھا۔ میں ٹکٹکی باندھے آسمان کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ تو یہ صاحب بول اُٹھے۔

''چلئے جناب! اب رات کو ٹھہرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"ارے صاحب! واقعی گھر جانا مشکل ہے۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔"

اب اندھیرا چھا گیا تھا۔ لوگ چٹ پٹ دروازوں پر کنڈیاں چڑھاتے سننے جا رہے تھے۔ دیر تک ہم محو گفتگو رہے۔ اور اب تعارف بھی ٹھیک ہوا تھا۔

صبح تڑکے ہی لوگ درگاہ کے احاطے میں جمع ہو گئے تھے۔ اور عورتیں آہ وزاری کر رہی تھیں میں نے ایک ایک سے پوچھ کر حقیقت جاننے کی کوشش کی۔ سب کے مُنہ پر جیسے تالے چڑھے تھے۔ میں نے ٹھان لی کہ حقیقت جان ہی لوں گا۔ میں نے اس طرف قدم بڑھائے قریب جا کر میں اچنبھے میں پڑ گیا۔ میرے پیروں تلے کی زمین جیسے کھسکنے لگی۔ اُسکی آنکھیں پُرنم تھیں۔ شاید کہنا چاہتی تھی کہ....

''یہ انسان میری خدمت اتنی جلدی کیسے بھول جاتے ہیں۔ میں رحمت ہوں۔ مجھے گھروں سے مت نکالو۔"

وہ کوئی بلا نہیں بلکہ ایک گائے تھی۔ وہی جس پر ہم اسکول میں مضمون لکھتے تھے۔ گائے ایک پالتو جانور ہے۔

لیکن شک اور نفرت کے دائرے میں آ چکی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بے چاری۔

☆☆☆

اندر کی آواز

وہ اپنے ریڈنگ روم میں کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کتاب دلچسپ تھی۔ جبھی تو اُسنے دروازے پر اندر سے ہی تالا چڑھا دیا تھا تاکہ خواہ مخواہ کوئی خلل نہ پڑے۔ کچھ دیر بعد اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اور وہ چونک گیا۔ عظمت ایک خوبرو نوجوان تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں ،قرینے سے تراشے ہوئے چھوٹے چھوٹے بال۔ اُس کے فکر وخیال میں بلا کی پختگی تھی۔ وہ ہر مسئلے پر باریک بینی سے سوچتا رہتا۔ بچپن سے ہی ذہین جو تھا۔ بدیش میں رہنے کی وجہ سے اپنے علاقہ کے حالات سے نابلد رہا۔ وہ سچ میں نہیں جانتا تھا کہ اس عرصے میں اس کے علاقے میں کتنے لوگ مارے گئے۔ بشیر خورشید۔ اُس کے ہم عمر۔ جو اُس کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔۔ اب نہیں رہے۔ سوائے تاسف اور افسوس کے وہ کرتا بھی کیا۔

فون کی گھنٹی لگاتار بج رہی تھی۔ بالآخر اس نے مجبور ہو کر فون کو ہاتھ میں لے ہی لیا۔

''تم ہمارے گروہ کے لئے کام کرو گے"۔

ایک مہیب آواز آئی۔ آواز سنتے ہی وہ تھرا گیا۔ اُسنے اس شخص سے سہمے سہمے پوچھا۔

''تم کون ہو۔ اور کیا کام کرنا ہے"۔

''ہمیں تم جیسے نوجوان کی ہی ضرورت ہے۔ جو قابل اور ذہین ہو۔''

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اس کام کے لئے اچھی خاصی تنخواہ دی جائے گی۔تمہیں سارے سُکھ نصیب ہونگے۔تم بس حامی بھرلو۔''

عظمت سوچ میں پڑ گیا۔اوراس پیش کش کامختلف زاویوں سے جائزہ لینے لگا۔ اُس نے یہ آواز پہلی بارسنی۔ایک انجانی سی آواز۔وہ ایک طرف کام کی پیش کش پر غور کرتا رہا۔جس کی اُسے ضرورت تھی۔مگراس انجانی اورڈروانی آواز نے اُسے فکر میں ڈال دیا۔اُس کے ذہن میں طرح طرح کے خدشے پیدا ہورہے تھے۔

''بھلا وہ شخص جسے میں جانتا تک نہیں ہوں کیسے میرا ہمدرد ہوسکتا ہے وہ بھی آج کے دور میں۔جب لوگ اپنی جھوٹی آن بان قائم کرنے کے لئے غلط ملط دھندوں کا سہارا لیتے ہیں۔دوسروں کے خون سے اپنے محلوں کی زیبائش کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے"۔

مگر اُسے کام کی سخت ضرورت تھی تا کہ وہ ماں باپ کی مدد کر سکے۔جنھوں نے اسکو بدیش میں تعلیم دلانے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔یہانتک کہ زمین بھی بھیج دی تھی۔عظمت نے بھی انکے جذبے کی خوب قدر کی اور وہ بدیش میں رہ کر بھی نئ تہذیب کی رعنائیوں میں ڈھلنے سے بچتا رہا۔کلب، گرل فرینڈ، عیاشیاں۔ان سب سے دور رہا۔پھر بھلا وہ ایک انجانی آواز کی پیش کش پر بنا سوچے سمجھے کیسے لبیک کرتا۔وہ سوچوں میں گم ہی تھا کہ اچانک بجلی کڑکی اور دیکھتے ہی دیکھتے زوروں کی بارش شروع ہوئی۔بارش کے ساتھ تیز ہوا بھی چلنے لگی۔اُسکے کمرے کی کھڑکیوں کے پٹ زور زور سے ٹکراتے رہے۔اور گرج چمک کے ساتھ ہی وہ سوچوں کی دنیا سے کٹ گیا۔اُسنے دیکھا کہ بارش کی چھینٹیں اندر کمرے میں آرہی ہیں۔اُسنے ایک دم اُٹھ کر کھڑکیاں بند کردیں۔اور راحت کی سانس لی۔

''موسم کا اچانک بگڑنا۔ کہیں کسی خطرے کی گھنٹی تو نہیں۔ شاید۔ کوئی جال بُنا جارہا ہے۔ جس میں مجھے جکڑنے کی کوشش ہورہی ہے"۔

اتنے میں باہر سے شور شرابا سنائی دیا۔ وہ باہر آیا۔ اُسنے دیکھا کہ لوگ ایک ویران جگہ کی طرف دوڑے جارہے ہیں۔ وہ بھی حیران و پریشان انکے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا۔ اس ویران جگہ پر ایک سر کٹی لاش دیکھ کر وہ افسردہ ہوگیا۔ وہ لاش کو دیکھے جارہا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو گررہے تھے۔ عورتیں اپنے سینے پیٹ رہی تھیں مرد آپس میں سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ اُسنے ایک کو کہتے ہوئے سنا۔

''بے چارے نے اپنے حق کے لئے نعرہ بلند کیا کیا۔ زندگی سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا۔"

اتنے میں لاش کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ وہ ٹوٹے قدموں گھر واپس آیا۔ وہ اس وحشی حرکت پر سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بجی۔

''ہیلو"۔ عظمت نے تھرتھراتے ہوئے کہا۔

''اُس کی لاش کو دیکھ کر افسوس ہورہا ہے۔ اُس کو بہت سمجھایا۔ پر نہ مانا۔ ہمارے خلاف بلند ہونے والی آواز کو خاموش کردیا جاتا ہے۔"

''تم کون ہو۔ مجھ سے کیا چاہتے ہو"۔ اُسنے پوچھا۔

''تم بس ہمارے لئے کام کرو۔ ہم تمہیں مالا مال کردیں گے۔ تمہاری سات پشتیں آرام سے زندگی بسر کریں گی"۔

''مجھے کام کی ضرورت ہے۔ مگر کام ڈھنگ کا ہو۔ جب ہی کروں گا"۔

''تنخواہ ایڈوانس میں ملے گی۔ ایک لاکھ روپیہ"۔

''ایک لاکھ روپیہ۔ اتنی بڑی رقم۔"

وہ ششدر ہو کر رہ گیا۔ وہ دوڑتے ہوئے ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ اور ماں سے کہنے لگا۔

''ماں۔اب بُرے دن ٹل جائیں گے۔میں تمہارا علاج اچھے سے اسپتال میں کراؤں گا۔تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

اس کی ماں سِل کی مریضہ تھی۔عظمت کمرے میں الٹے پاؤں پھر آیا۔وہ شخص فون پر بدستور بولے جا رہا تھا۔عظمت نے پوچھا۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا"۔

''تم پہلے اپنی تنخواہ تو لے جاؤ۔کل گول مارکیٹ کی بلڈنگ نمبر۴ کے روم ۴ میں آنا۔"

یہ کہتے ہوئے اُسنے فون بند کر دیا۔عظمت کو اپنے سوال کا سیدھے سیدھے جواب نہیں ملا۔وہ سوچتا رہا۔دیر تک سوچتا رہا۔اس سے لگا کہ اس شخص کی نیت میں کوئی کھوٹ ہے۔اُسنے طے کر لیا کہ حقیقت جان ہی لوں گا۔اتنے میں کھانسنے کی آواز آئی۔وہ ماں کے کمرے کی طرف دوڑ پڑا۔اسنے دیکھا کہ ماں کے منھ سے خون نکل رہا ہے وہ پریشان ہو گیا۔اسنے ماں کو دوائی پلا کر لیٹا دیا۔

'میں تمہارا علاج کرواؤں گا۔تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔وہ دبے لفظوں ماں کو دلاسہ دینے لگا۔

صبح ہوتے ہی وہ گول مارکیٹ کی طرف چل پڑا۔یہ مارکیٹ ایک بدیشی کمپنی نے تعمیر کیا تھا۔تب سے اس کمپنی کے اہلکار وہاں برابر موجود تھے۔کچھ مسافت طے کرنے کے بعد عظمت اس مارکیٹ میں پہنچ ہی گیا۔

''خوش آمدید میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا''

ایک شخص نے کہا۔وہ اسکے پیچھے پیچھے تنگ و تاریک کوچوں سے گزر کر بلڈنگ کے نزدیک پہنچ گیا۔آس پاس بہت بھیڑ تھی۔لوگ اپنی دُھن میں مصروف ضرورت کی چیزیں خریدتے نظر آرہے تھے۔سورج کی شعاعیں مارکیٹ کی تنگ و تاریک گلیوں پر

پھیل رہی تھیں۔اور ٹمٹماتے قمقموں کی روشنی دن کی روشنی میں ضم ہو کر آہستہ آہستہ اپنا وجود کھوتی جا رہی تھی۔بھیڑ بڑھتی گئی اور یہ مارکیٹ کوئی بڑا کاروباری اڈہ معلوم ہونے لگا۔اس نے وہاں ایک شخص کو ایک ضعیف عورت کو اسپتال کی طرف لے جاتے ہوئے دیکھا۔وہ چونک سا گیا۔اسکو وہ لمحہ یاد آیا جب اسنے اپنی ماں کے منہ سے خون نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور پریشان ہو کر ماں سے کہہ رہا تھا۔

'ماں تم میرے لئے انمول ہو۔تم نے مجھے پال پوس کے بڑا کیا۔خود سختیاں جھیلی۔مگر میری زندگی پر غم کے بادلوں کا سایہ تک پڑنے نہ دیا۔میں کام کروں گا۔"

پھر ایکدم سے وہ روم میں داخل ہو گیا۔ایک شخص ٹھاٹ سے کرسی پر بیٹھا تھا۔اسنے ایک عمدہ سوٹ اور بڑی سی ہیٹ پہن رکھی تھی۔رنگ اور صورت سے بھیانک لگ رہا تھا۔اُس کا حلیہ ہی اسکے اندرون کی عکاسی کر رہا تھا۔

''وہ۔سر۔آپ نے کام کے لئے بُلایا تھا"۔عظمت نے دھیمی آواز میں کہا۔

''ہم جانتے ہیں کہ تمہاری ماں بیمار ہے۔تم تنخواہ لے جاؤ اور ماں کا علاج کراو۔کام بعد میں سمجھا دیا جائے گا۔''

ماں کا پل پل کھانسنا، وہ خون کی قے کرنا۔چہرے کا پیلا پن۔یہ سب اسکی نظرو ں میں پھر رہا تھا۔اسنے اجازت لے لی اور وہاں سے چل پڑا۔ایک سومو گاڑی کرایہ پر لی اور ماں کو اسپتال لے گیا۔ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ کروانے کا مشورہ دیا اور کچھ دوائیاں بھی تجویز کرتے ہوئے کہا۔مریضہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔اگر۔۔۔۔۔۔؟

وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر دوائی کی دُکان کی طرف بڑھنے لگا۔اُسنے دوائی ہاتھ میں لے ہی لی تھی کہ اندر سے کوئی قوت اس کو للکارنے لگی۔

''یہ کیا کر رہے ہو عظمت۔ماں کے لئے دوائی خریدنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ تنخواہ کس کام کے لئے ملی ہے"۔

"تمہیں کیا۔ تنخواہ کسی بھی کام کے لئے ملی ہو۔ مجھے بس ماں کا علاج کروانا ہے"۔

"ماں۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ اس دھرتی ماں کے بارے میں کبھی سوچا ہے۔ جو اپنی چھاتی پر فصلیں اُگا اُگا کر تمہیں کھلاتی ہے۔ پانی کی دھاریں اُچھال کر تمہیں پلاتی ہے۔ تمہیں پناہ دیتی ہے۔"

"لیکن۔۔۔ تم کون ہو"۔

میں تمہاری ہی آواز ہوں۔ تمہارے ضمیر کی آواز۔"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی وہ ہڑبڑا گیا۔

"کون"

"میں"

وہی آواز۔

"غور سے سنو! تمہارے پاس براؤن شوگر کی ایک بڑی کھیپ پہنچادی جائے گی۔ ان لوگوں کو کھلا دو۔ جو حق کے لئے آواز اُٹھاتے ہیں۔ تاکہ وہ خاموش رہیں اور ہم تمہارے علاقے کو ہمیشہ کے لئے اپنی سلطنت میں ضم کرسکیں۔"

اس کے ہاتھوں سے دوائی کی بوتل سرک کر فرش پر گر پڑی اور چکنا چور ہوگئی۔ اُسنے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ پھر دھرتی ماں کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔"

"میری دھرتی ماں بہ مثلِ جنت ہے مجھے تروتازہ ہوا دیتی ہے۔ کھلاتی پلاتی ہے۔ مجھے جان سے زیادہ پیاری ہے۔ میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ ہرگز نہیں۔"

وہ تیز تیز قدم اُٹھا کر جان کی پروا کئے بغیر گول مارکیٹ کی طرف رقم لوٹانے کے لئے روانہ ہوا۔



بھینسیں

بھینسیں ایک ہی تھان پر رہ کر اُکتا گئی تھیں اور وہ جب چپکے سے تفریح پر نکلیں تو ساری ریاست میں بھگدر مچ گئی۔ کیا راجا، کیا پرجا۔ سپاہی سے لیکر پولیس سربراہ تک سب پریشان ہوگئے۔ یہ تو بھینسوں میں بھینسیں تھیں۔ اقبال مند بھینسیں ان کے لئے سب کچھ خاص تھا۔ خاص گئوشالہ۔ خاص ناند۔ خاص محافظ۔ اور حفظانِ صحت کے لئے خاص طبیب مقرر تھے۔ جو طرح طرح کے کھانے جانچ کر کے تجویز کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انکے لئے ایک خاص نگران مامور تھا۔ ہرگوپال۔ جو بچپن سے ان کے ساتھ پلا بڑا تھا ان کے اشاروں کو اچھی طرح سمجھ لیتا۔ ان کے مالک ہفتے میں ایک آدھ بار انھیں دیکھنے ضرور آتے۔ جب آتے تو گارڈ پر مامور سپاہی وسل بجالیتے۔ اور بھینسیں سمجھ جاتیں کہ مالک آرہے ہیں۔

جب پچھلی بار وہ بدیسی تفریح سے گھر لوٹے تو آتے ہی بھینسوں کو دیکھنے گئے۔ اور کچھ دیر ان کی پیشانیاں سہلا کر انھیں پیار کرتے رہے۔ اور بھینسیں بھی اُس کے ہاتھوں کو چاٹتی رہیں۔ اس کے لباس کو سونگھتی رہیں اس کے لباس پر لگی بدیسی عِطر کی خوشبو نے بھینسوں کا دل لُبھالیا۔ اور ان کے دِل میں کسی خوب صورت جگہ کی سیر کرنے کی تمنا جاگ گئی۔ تبھی بھینسیں رات کے آخری پہر میں جگالی کئے بغیر ہی نکل گئیں۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ سوائے ہرگوپال۔ جو ان کے پیچھے پیچھے نکل گیا تھا۔

اُس رات ڈیوٹی پر مامور سپاہیوں کی جب آنکھ کھُلی تو بھینسیں غائب پا کر پریشان ہو گئے۔قرب وجوار میں دیکھ آئے۔جب اتہ پتہ نہ ملا تو کوٹھی پر جا کر اُس کو اطلاع دی۔کہ

''بھینسیں تھان پر نہیں ہیں۔شاید ان کو کسی نے چُرا لیا ہے۔''

یہ سنتے ہی اُس پر جیسے بجلی گری وہ حواس باختہ ہو گئے۔اور نزدیکی پولیس ہیڈ کواٹر کے عملے کو لائن حاضر کروا دیا۔کیا سپاہی، کیا افسر۔سب سر جُھکائے اُس کے سامنے پشیمان کھڑے ہوئے تھے۔وہ بوکھلا کر ایک ایک پر برس پڑے۔ ڈیوٹی پر مامور محافظوں کی وردی تو اُترنی ہی اترنی تھی۔افسر کو کھری کھری سنائی۔

''چوبیس گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔میری بھینسوں کو لے آو۔ورنہ تمہاری خیر نہیں۔اتنا بڑا سیکورٹی لیپس ہوا۔تم بدمست ہو کر کہاں جھوم رہے تھے۔جاؤ اور ڈھونڈو۔''

''بڑے افسر نے تمام تھانوں کی پولیس کو خبر کر دی، اُس کی سات بھینسیں چوری ہو گئی ہیں۔چوبیس گھنٹوں میں بھینسوں کو لے آؤ۔سب کام پر لگ جاؤ۔''

سارے پولیس محکمہ میں بھگدڑ مچ گئی۔اور تمام سپاہی ڈیوٹی پر لگ گئے ان کی نیند اُڑ گئی۔ایس پی کی سربراہی میں گئوشالے سے ہی تفتیشی کاروائی شروع ہوئی۔اور وہ سراغ ڈھونڈنے لگے۔ایس پی نے تمام نامی چوروں کی فائلیں منگوائی ایک ایک فائیل غور سے دیکھ لی۔اور سپاہیوں سے کہا۔

''یہ چوروں کی فہرست ہے یہ خطرناک چور ہیں۔ان کو گرفتار کر کے لاؤ۔''

سپاہی چوروں کی تلاش میں نکل پڑے۔تمام علاقے میں اس وقت شور وغل مچ گیا۔جب سپاہی چوروں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لا رہے تھے۔اور گئوشالے کے قرب میں ہی انھیں ایک کوارٹر میں بند کر دیتے تھے۔جب سارے چور دھر لئے گئے تو ایس

پی پوچھ تاچھ کرنے لگے۔

''تم عالم خان ہو۔تم نے بھینسیں چُرائی ہیں"۔

''نہیں سر" کہہ کراُس نے سر جُھکالیا۔

''یہ تمہاری ہی کارستانی ہے۔سچ سچ بتاؤ۔بھینسیں کہاں ہیں"۔

اُس نے چُپ سادھ لی۔ایس پی بھڑک اُٹھے اوراُس کے چہرے پر زور سے ایک کے بعد ایک تھپڑ رسید کیئے۔بے چارے کا چہرہ لال ہوگیا۔اور پانچوں انگلیوں کے نشاں چہرے پر ثبت ہو گئے۔جب وہ غش کھا کر گر پڑا تو ان کے خیال سے اُتر گیا۔پھرایک اور چور کی طرف مُڑے اوراُس سے پوچھا۔"

''بھینسیں کتنے میں بیچ آئے ہو؟۔سچ سچ بتاؤ۔نہیں تو ہڈی پسلی ایک کردوں گا۔"

وہ ڈر کے مارے تھرتھرایا۔اور ہکلاتے بولا۔"

''سر میں نے بھینسیں نہیں چرائی ہیں"۔

''کس نے چرائی ہیں"۔

''سر میں نہیں جانتا"۔ایس پی نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

''اُلٹالٹکادو"۔

پھر بے چارے کی خوب پٹائی ہوئی۔چیختا چلاتا رہا۔کسی کے دل میں رحم نہیں آیا۔آتا بھی کیسے۔یہاں تو ہر ایک پولیس والے کی وردی داؤپر لگی تھی۔جب چور نے چپی سادھ لی تو ایک بالٹی پانی منگوایا گیا اور سپاہی چور کو اوندے منہ ڈبکی لگاتے رہے۔اُس کی حالت ابتر ہوگئی تو وہ چلا چلا کر بولا۔

''مجھے معلوم ہے۔بھینسیں کہاں ہیں۔پھراُس کو جیپ میں بٹھا کر کڑے پہرے میں روانہ کردیا گیا۔

''مجھے اطلاع کرتے رہنا۔''

ایس پی نے سپاہیوں سے کہا۔ چور کے اشاروں پر جیپ چلتی رہی۔ آخر وہ رامو چرواہے کے گھر پہنچ گئے۔ علاقے کی نا کہ بندی کی گئی۔

''رامو چرواہا کہاں ہے"۔

آنگن میں بیٹھے ایک بوڑھے آدمی سے سپاہی نے پوچھا۔

''حضور۔ گستاخی معاف۔ کیا رامو سے کوئی خطا ہوئی ہے؟۔"

''سوال مت کرو۔ سیدھے سیدھے بتادو۔ وہ کہاں گیا ہے"۔

''حضور۔ وہ پاس والی ندی پر بھینسوں کو پانی پلانے گیا ہے۔ سارے سپاہی ندی کی طرف دوڑ پڑے۔ رامو چرواہا سچ میں بھینسوں کو پانی پلا رہا تھا۔ اُس پر نظریں پڑتے ہی چور نے بے صبری سے چلایا۔

''وہ رہا رامو چرواہا"۔ سب کا دھیان اُس کی طرف گیا۔ چور بھاگ نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور اُسے بھاگتے دیکھ سپاہی نے آواز دی۔"

''رک جاؤ۔ رک جاؤ۔''

اُسنے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ وہ ندی میں کود پڑا۔ اور پانی کے تیز بہاؤ میں ہچکولے کھاتے آنکھ جھپکتے ہی لہروں میں سما کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اوران کے خیال سے اُتر گیا۔ پھر سپاہیوں نے رامو چرواہے کو دو چار تھپڑ رسید کئے۔ وہ روتا بلکتا بولا۔

''مالک مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔''

''مارو کم ذات کو"۔

ایک دو سپاہی اس پر جھپٹ پڑے۔ بے چارہ کھسک کر دو تین گز نیچے کی طرف لڑھک گیا۔ پھر ایک سپاہی نے ہاتھ بڑھا کر جلدی سے پکڑ لیا اور اُس کو ندی میں گرنے سے بچالیا۔ رامو چرواہے نے گڑگڑا کر کہا۔"

''مجھے چھوڑ دو''۔

''چھوڑ دیں۔ اُس کی بھینسوں کو کہاں چھپالیا ہے۔ بتاؤ۔ نہیں تو گاڑ دیں گے''

''مالک میں نے ہرگوپال کو دودھ پتھری کی طرف بھینسوں کو لیجاتے ہوئے دیکھا ہے''۔

''تو سچ بولتا ہے''۔

''ہاں۔ مالک''

پھر راموچرواہا بھی ان کے خیال سے اُتر گیا۔ ایک سپاہی نے ایس پی کو یہ اطلاع دی اور ایس پی اُس کی کوٹھی پر چلے گئے۔ جہاں وہ اضطراری حالت میں پارک میں گھوم رہے تھے۔ ایس پی کو دیکھتے ہی بڑے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''ایس پی کوئی سراغ ملا کیا''۔

''جناب بھینسیں ہرگوپال نے چرائی ہیں''۔

''کیا خرافات بکتے ہو''۔

''جناب ہمیں خبر ملی ہے کہ ہرگوپال بھینسوں کو دودھ پتھری کی طرف لے گیا ہے۔ جہاں انھیں آسانی سے بدیسی چوروں کو بیچا جاسکتا ہے''۔

''ایس پی۔ تم ہوش میں ہو۔ میرے وفادار نوکر پر تہمت لگانے کا نتیجہ جانتے ہو۔''

''جناب گستاخی معاف۔ ہرگوپال ہی بھینسوں کو یہاں سے لے گیا ہے۔ جناب تھوڑا انتظار کیجئے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا۔''

ایس پی نے سپاہیوں کی کئی ٹولیاں دودھ پتھری کی طرف روانہ کیں۔ اور خود بھی چلے گئے۔ اپنے ساتھ سات قیمتی گاڑیاں بھی لیں تا کہ بھینسوں کو آرام سے واپس لائیں۔ جب وہ دودھ پتھری پہنچ گئے۔ تو سپاہی اردگرد کی چوٹیوں پر پھیل

گئے۔ ہرگوپال کے پاس میں دو بھینسیں تھیں وہ ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رہا تھا۔ اور پٹی باندھتے ہی اس نے زور سے سیٹی بجائی۔ تو بھینسیں اِدھر اُدھر چل پڑیں۔ اتنے میں ایس پی جھاڑیوں سے گزرتے ہوئے ہرگوپال کے پاس پہنچ گئے۔

''ہاتھ اُوپر کرو"۔ اُسنے آواز دی۔

ہرگوپال نے مُڑ کر جب ایس پی کو دیکھا تو اُس نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے کہا۔

''آیئے حضور۔ آپ بھی مزہ لیجئے۔ بھینسیں آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔''

ایس پی ہکا بکا ہو گئے۔ اور ہرگوپال سے پوچھا۔

''دوسری بھینسیں کہاں ہیں"۔

''حضور۔ وہ ان گھنی جھاڑیوں میں چُھپ گئی ہیں۔ آپ تماشا دیکھئے۔

ایس پی نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

''سپاہیو! بھینسوں کو لے آؤ۔ اور یاد رہے کہ بھینسوں کو جھاڑیوں سے کوئی زخم نہ لگے۔'' ہرگوپال نے حیرت سے کہا۔

''ارے حضور۔ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ انھیں جی بھر کر کھیلنے دیجئے۔ ہم کھیل کو بیچ میں چھوڑ نہیں سکتے۔"

اتنے میں سپاہی ساتوں بھینسوں کو لے آئے اور انھیں گاڑیوں میں لاد دیا۔ پھر وہ واپس روانہ ہو گئے۔ اور سب کو اطلاع دی کہ بھینسیں مل گئیں۔

بھینسیں تھک چکی تھیں وہ اپنے اپنے تھان پر جا کر آرام کرنے لگیں۔ صبح جب عورتیں دوہنی لیکر دودُھ دُوہنے آئیں۔ تو بھینسوں نے دودُھ میں دوگنا اضافہ کر کے انھیں متعجب کر دیا۔ ہرگوپال اچھلتے اچھلتے کوٹھی کی طرف دوڑا اور چلاتے چلاتے مالک سے کہا۔"

''بھینسوں نے دودُھ میں دوگنا اضافہ کردیا ہے"۔

اُس روز کوٹھی پر جشن کا سماں تھا۔شادیانے بج رہے تھے مٹھائیاں بانٹی جارہی تھیں۔ رعایا، عزیز واقارب، ہمسائے سبھی وہاں موجود تھے۔اور وہ مخاطب ہو کر بولے۔

''بھائیو اور بہنو! میں ان تمام سپاہیوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔جنھوں نے چوبیس گھنٹے کے اندر میری بھینسوں کو ڈھونڈ نکالا۔ان کو ضرور اعزازات سے نوازا جائے گا۔ بھائیو اور بہنو خوشی کی بات ہے۔ کہ میری بھینسوں نے مقامی سیر کرنے سے دودُھ میں اضافہ کردیا ہے۔اس لئے بڑے نیتاجی نے میری بھینسوں کے لئے الگ سے فنڈس مختص کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ بھینسوں کو بدیسی تفریح پر بھیجا جاسکے۔اور دودُھ کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ بھائیو اور بہنو!۔یہ عام بھینسیں نہیں ہیں۔یہ میرے لئے ملکہ وکٹوریہ سے بڑھ کر اہمیت رکھتی ہیں۔اس لئے ان کے لئے کچھ خاص محکمہ جات قائم کئے جائیں گے۔تاکہ ان کی بہتر دیکھ بھال ہوسکے۔اس طرح بے روزگار نوجوانوں کے لئے روزگار کے وسائل بھی پیدا ہونگے۔اسی اثنا میں کچھ لوگ ہاتھوں میں بینر لئے اندر داخل ہوگئے۔اور وہ نعرے بلند کرنے لگے۔

''دنگے میں مارے گئے لوگوں کے قاتلوں کو ڈھونڈ نکالو۔ڈھونڈ نکالو۔''

اس نے شرارت بھرے لہجے میں اپنی تقریر کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔

''بھائیو اور بہنو!" یہ منتری نواب اعظم خان کی بھینسیں ہیں۔یہ خاص، خاص بھینسیں ہیں"۔

پھر وہ سب خاموش ہوگئے۔اور وہاں موجود سپاہیوں نے پھرتی سے جگہ کو خالی کروادیا۔



بل کھاتی راہیں

وہ پانی کی ڈوبتی اُبھرتی لہروں کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ اُس سے ایک آہٹ سنائی دی تسکینؔ نے ایکدم سے چونک کر ارد گرد نظریں دوڑائیں اور اپنے قریب ایک خوبصورت لڑکی کو کچھ تلاش کرتے ہوئے دیکھا جسکی آنکھیں جھیل کے نیلگوں پانی کی مانند تھیں وہ اُس کی نیلی نیلی آنکھوں میں ایک پل کے لئے کھوسا گیا۔ لڑکی سر تا پا خوبصورتی کا مجسم پیکر لگ رہی تھی جبھی تسکینؔ کے دل میں ہلچل مچ گئی وہ ان نیلی سندر سندر سی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب گیا ان آنکھوں میں عجب سی کشش تھی وہ سہمے سہمے آگے بڑھ کر بولا۔

''محترمہ! کچھ کھو گیا ہے کیا؟''

''نتھ''

اس نے دبی زبان میں جواب دیا۔

''میں ڈھونڈنے میں مدد کروں کیا؟''

''جی شکریہ''

تسکینؔ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو نتھ پہنے کی ویسے بھی ضرورت نہیں ہے آپ تو ماشاء اللہ بہت خو بصورت ہیں۔ آپ کا حسن و جمال کسی بھی طور زیوروں کا محتاج نہیں ہے۔''

''جی شکریہ''

اپنی تعریف سنکر جونہی فریحا کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا تو تسکینؔ نے ایک لمحہ بھی ضائع کیئے بغیر کہا۔

''آپ کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ یہ آنکھیں مجھے دیدو۔''

اُسنے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

''تم ہوش میں ہو۔ یہ آنکھیں انمول ہیں ان سے ہم قدرت کی صناعی کے لامتنا ہی کرشمے دیکھتے ہیں۔ انھیں خود سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ لوگ کہتے ہیں اپنے دکھ مجھے دیدو۔ لیکن تم مجھ سے میری آنکھیں مانگتے ہو۔ کیا بے تکی بات ہے۔ تم جیتے جی مجھے مارنا چاہتے ہو۔''

تسکینؔ نے سرنفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں .... نہیں۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ دراصل مجھے آپ کی آنکھیں بھا گئیں ہیں اگر آپ میری شریک حیات بننا پسند کریں تو یہ آنکھیں ہمیشہ میرے پاس رہیں گی''

''تم بڑے بے شرم ہو۔ شادی بیاہ کی باتیں تو بڑے بزرگ طے کرتے ہیں۔ اور ہاں مجھے پانے کے لیے دودھ کی نہر لانی پڑے گی۔ جیسے فرہاد نے شیرین کے لئے لائی تھی''

''یہ سب خیالی قصے ہیں محترمہ!''

اتنی سی دیر میں ناک کی نتھ فریحاؔ کے ہاتھ لگ گی۔ وہ سڑک پر رکی کار میں بیٹھ کر جانے لگی کہ تسکینؔ نے اُس سے پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''اپنا پتہ تو دیتے جایئے''

اُسنے مسکراہٹ بکھرتے ہوئے کہا۔

''میں خوشبو ہوں ہواؤں میں رہتی ہوں''

''پھر تو میں سونگھ کر ہمیشہ کے لئے آپ کو دل میں قید کردوں گا۔''

اُس نے ترچھی نظر ڈال کر کہا۔

''میں مس فریحا ہوں۔''

اور اپنا پتہ دیکر وہ چلی گئی انسان کی فطرت ہے جب بھی اسے کوئی چیز پسند آتی ہے تو وہ اسے حاصل کرنے کی انتھک کوشش کرتا ہے تسکین رات بھر فریحا کے خیالوں میں گم سارہا اسنے قصد کرلیا کہ وہ فریحا کو شریک حیات بنا کرہی رہے گا۔ اور اسی لمحے اسنے اپنے دل میں محبت کے تاج محل کی سنگ بنیاد رکھی۔ خاندانی جاہ وحشمت کے اعتبار سے دونوں کے پلڑے برابر تھے اس لئے رشتہ طے ہونے میں کوئی دقت نہ ہوئی

ایک دن انگوٹھی پہناتے وقت تسکین نے فریحہ کو اسی کی بنائی ہوئی تصویر پیش کی۔ جس میں اس کی آنکھوں کی خوبصورت عکس بندی کی گئی تھی۔ فریحا نے دبی زبان میں کہا۔

''میری آنکھوں کا عکس اُتارنے کے لئے بہت بہت شکریہ''

اور پھر دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے تکتے رہے۔ اور دونوں کے چہروں سے خوشی جھلک رہی تھی۔

کچھ عرصہ بیت گیا اس دوران وہ کئی بار مل چکے تھے۔ تسکین اس سے بے حد پیار کرنے لگا تھا اب اس نے اپنے دل کے کینوس پر فریحہ کی تصویر سجالی تھی۔

اس روز وہ اپنے لان میں ٹہل رہا تھا کہ ایک اندوہناک خبر نے اسکے بدن کی فضا میں جیسے بارود بھر دیا وہ حواس باختہ ہوکر اسپتال کی طرف دوڑ پڑا۔

''تمہیں جینا پڑے گا''

وہ راستے میں بڑبڑا رہا تھا۔ کچھ ہی سمے میں وہ اسپتال پہنچ گیا فریحا حادثے میں بری طرح مضروب ہوچکی تھی۔ وہ ایک لاش کی طرح بیڈ پر پڑی تھی۔ تسکین سے ضبط

نہیں ہو رہا تھا آنکھوں سے آنسوں ٹپک ٹپک کر گر رہے تھے ایک آدھ فریحا کے ہاتھ پر گر گئے محبت اور ہمدردی کے ان آنسوؤں نے اس کے جسم میں حرکت پیدا کی۔ اُسنے آنکھیں کھول کر اپنی بھرپور نظروں سے تسکینؔ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری آنکھیں میری سہیلی سلمیٰ کو دیدینا۔ اُس کی تاریک دنیا میں روشنی ہو جائے گی اور پھر اسے بیاہ کر لینا۔ تاکہ یہ آنکھیں تمہارے سامنے رہیں''

یہ کہہ کر فریحا چل بسی۔ اُس کی لاش پر سر رکھ کر تسکینؔ زار و قطار رو رہا تھا فریحا کا پوسٹ مارٹم ہوا اور اس کی آنکھیں محفوظ کر لی گئیں۔ پھر کچھ گھنٹے بعد سلمیٰ اسپتال میں اڈمٹ ہوئی۔ تسکینؔ برابر اس کا حوصلہ بڑھاتا رہا اور آپریشن تھیٹر کے بالکل قریب پہنچ کر وہ اسے مخاطب ہوا۔

''اب تم دیکھ سکوگی۔ فریحا نے تمہیں آنکھیں عطیہ میں دیدی ہیں۔ میری فریحا نے۔''

''جی! وہ میری بھی تو سہیلی تھی''

پھر وہ آپریشن تھیٹر میں چلی گئی۔ آپریشن ہوا۔ ایک عشرہ کے بعد اُس کی آنکھوں کی پٹیاں کھولی گئیں۔ اُس روز وہاں سب موجود تھے سلمیٰ کا چہرہ کھلا کھلا سا لگ رہا تھا اور خوشیاں صاف صاف جھلک رہی تھیں۔ بولی

''اب میں دیکھ سکتی ہوں۔ مجھے گھر لے چلو!''

تسکینؔ کو ایک ساعت کے لئے لگا جیسے فریحاؔ کھڑی اسے گھر جانے کے لئے اصرار کر رہی ہو۔ اُسنے بے صبری سے سلمیٰ کے باپ سے کہا۔

''بابو جی ! مجھے یہ آنکھیں بہت بھا گئیں ہیں۔ سلمیٰ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیجئے۔

سلمیٰ چونک کر بولی۔

''مگر''

''مگر کیا''

''سوری میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی کیونکہ میں کنواری ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی

تسکین زندگی کی ان بل کھاتی راہوں میں ششدر ہو کر رہ گیا۔ ۔۔۔!

☆☆☆

سیلابی دلہن

ببلی یہ سوچ کر دل کو تسلی دیتی رہتی کہ

''صبر کا پھل خدا دیتا ہے۔ دیر سویر دلہن تو بنوں گی۔ اب تو استانی بھی تعینات ہوئی ہوں۔ اس مادہ پرستی کے دور میں ہاتھوں ہاتھ بیچ چڑھ جاؤں گی۔ کیونکہ لوگ لالچی ہو گئے ہیں''

وہ اپنی ماں شکنتلا کو بھی دلاسہ دیتی رہتی۔ جو اس کے لئے رشتہ تلاشتے تلاشتے تھک چکی تھی۔ اس کے رشتے میں اس کی جنم کنڈلی آڑے آ جاتی۔ پنڈت بھی کہتے تھے۔

''کنیا کی کنڈلی کے پیچ ڈھیلے ہیں۔ اس کی کنڈلی لڑکے کی کنڈلی سے میل نہیں کھاتی"۔

یوں رشتہ ہوتے ہوتے رہ جاتا تھا۔ اور لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے۔ اس سے منسوب طعنوں کا سلسلہ اس کے جنم سے شروع ہوا تھا۔ وہ جب پیدا ہوئی تھی۔ تو بستی کے حالات بگڑ گئے۔ رہنماؤں کے ایرے غیرے بیانات سے ان کی جاتی میں خوف پیدا ہوا۔ وہ جاتیوں کو آپس میں بھڑکاتے رہتے۔ اور ہمیشہ ہی اپنی خرافاتی چالوں سے سیانے لوگوں کا ناک میں دم کر دیتے، جو پھر ہاتھ ملتے رہ جاتے۔ لوگ بھی کیا کیا کُفر کی باتیں کرتے۔ سارا دوش اس ننھی سی جان کو دیکر خوب جلی کٹی باتیں سناتے۔

''جنم جلی۔ بستی میں قدم کیا رکھے۔ خوشیاں ہی پُھر ہو گئیں۔ منحوس۔۔۔۔"
بستی کے حالات خراب ہونے میں بھلا اس معصوم کا کیا قصور تھا۔
''توبہ۔۔۔توبہ۔'' ان کی جاتی کچھ زیادہ ہی توہم پرست نکلی ورنہ کونسا اژدھا ان کی دنیا میں پھن مارتا۔ اچھا بھلا تو کھا پی رہے تھے۔ ٹھاٹ سے رہ رہے تھے۔ نہ جانے کن جوتشیوں کی اناپ شناپ باتوں میں آکر کوچ پر آمادہ ہوگئے۔ یہ بھلا کون جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ پھر یہ وہم پالن۔
''ہماری جاتی خطرے میں ہیں ہم مارے جائیں گے"۔
ایسی ہی بے شمار خوف کی باتیں۔۔ وہ ڈر گئے یا ڈرائے گئے تھے۔ بستی چھوڑ کر چلے گئے۔ تب ببلی چھوٹی تھی۔ اس کی ماں نے بستی والوں سے کہا تھا۔
''تم لوگ جنم بھومی کو چھوڑ رہے ہو۔ تم چلے جاؤ گے۔ لیکن ایک دن اپنے فیصلے پر ضرور پچھتاؤ گے۔''
اس پر ایک آدمی نے شرارت بھرے لہجے میں جواب دیا۔
''ہم ضرور بوریا بستر اگول کریں گے۔ مگر تم نہیں چل سکوگی۔ تمہاری گود میں یہ بلا جو ہے۔ جسنے سارا سکھ چین آتے ہی غارت کر دیا۔ ہماری دنیا کے سورج پر گرہن لگا دیا۔ کیا پتہ اور ابھی کیا کیا گل کِھلائے گی۔'' اس پر دونوں میں تکرار ہوئی۔
وقت کی رفتار ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے۔ مگر زندگی میں انتشار ہو تو دن رات کا سفر جیسے منٹوں میں کٹ جاتا ہے۔ اس بے چین ماحول میں ببلی نے کب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوئی۔ وہ قد کی لمبی تھی۔ چہرہ بیضوی رنگ گندمی تھا۔ با اخلاق اور بڑی شائستہ تھی۔ اب وہ کئی سالوں سے اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ مگر بیاہ کی فکر اس کو پریشان کرتی رہتی۔
اُس روز بھی گھر میں ہون رکھوایا تھا اس بھروسے کہ کوئی اچھا لڑکا مل جائے۔ مگر اس

کی کنڈلی اس کی پریشانی کا سبب بنتی۔ اسنے پنڈت جی سے عاجزانہ لہجے میں پوچھا۔

''پنڈت جی میری کنڈلی میں کیا کھوٹ ہے۔"

''بیٹی اب کی بار سب ٹھیک کردوں گا"۔

وہ ہتاش ہوکر سوچتی رہتی۔

''قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ پنڈت جی بھگوان تو نہیں جو کنڈلی بدل دے"۔

وہ چاہتی تھی کہ یہ پوجا پارٹ بند کروادیں۔ مگر سامنے ماں آنکھیں بند کئے کمرے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ پنڈت جی یہ اطمینان دلاکر چلا گیا۔

''بہت جلد ایک اچھے رشتے کی نوید مل جائے گی۔''

ہَون کے کچھ دن بعد ماں بیٹی برآمدے میں بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔ ماں کہتی تھی۔

''اب کی بار سارے بُرے سایے دُور دفع ہوگئے۔ بیٹی ایک اچھے رشتے کی خبر ملی ہے"

وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ پھر پنڈت جی نے آکر لڑکے کی کنڈلی دیکھ لی اور اُن سے کہا۔

''کنڈلیوں میں تھوڑا ٹکراو ضرور ہے مگر لڑکی اور گھر کے جل اشنان سے سب ٹھیک ہوجائے گا۔ آپ شادی کی تیاریاں کیجئے"

شکنتلا کچھ دیر کے لئے سوچوں کے سمندر میں گم ہوگئی۔ اور اس کے دماغ میں بار بار یہ الفاظ آرہے تھے۔

''جنم جلی، منحوس"

وہ خود سے بڑبڑاتی۔

''ہائے بھگوان۔ یہ لڑکی کیا مقدر لے کر آئی ہے۔اس کے تو بھاگ ہی پھوٹ گئے ہیں۔جب کنڈلیاں نہیں ملتی ہیں تو کیسے لڑکا ہاں کہے گا بھگوان میری بیٹی بن بیاہی نہ رہے۔''

پھر اس وقت ان کی باچھیں کھل گئیں جب رامیش نے شادی کے لئے حامی بھر لی رامیش ایک چھوٹی سی کمپنی میں کام کر رہا تھا۔ بھلا وہ اس مادہ پرستی کے دور میں اس بیاہ سے کیسے انکار کرتا ببلی مہینہ بھر چالیس ہزار تو کما لیتی تھی۔اُسنے کنڈلی کی پرواہ نہیں کی۔حالانکہ اُس کی ماتا جی نے اعتراض جتایا تھا لیکن رامیش نے ایک نہ سنی۔شادی کی تاریخ طے ہوئی۔اور وہ شادی کی تیاریوں میں جُٹ گئے۔جب ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں تو اچانک اُس وقت سراسیمگی پھیل گئی جب موسم نے بے وقت کی کروٹ لی۔آسمان پر چاروں طرف گھنے کالے بادل چھا گئے۔بیاہ سے کچھ دن پہلے بادلوں نے برسنا شروع کیا۔بادل برسے خوب برسے۔پانی جگہ جگہ جمع ہوگیا۔ندی نالوں کا بہاؤ تیز ہوگیا۔بجلیاں کڑکتی رہیں۔لوگ پریشان ہوگئے۔اخباروں پر شادیاں ملتوی ہونے کی خبریں آنے لگیں۔لگاتار بارشیں ہونے کے سبب شکنتلا کو سیلاب کا خدشہ پریشان کرنے لگا۔وہ سوچ رہی تھی کہ ببلی کے سسرال جانے پر خدانخواستہ وہاں کوئی سیلاب آیا تو لوگ اس کی بیٹی کو طعنے دیں گے۔جیتے جی مر جائے گی۔ابھی تو "جنم جلی، منحوس کے طعنے بُھلا نہیں پائی ہے۔وہ شادی کچھ وقت کے لئے ٹالنا چاہتی تھی۔مگر ایسا ممکن نہ ہوا۔

اُس روز گھر میں لوگوں کا بڑا جمگھٹا تھا۔آس پاس کی عورتیں،سہیلیاں،رشتہ دار سب مہندی رسم میں حاضر تھے۔زیادہ تر لوگ دوسری جاتی کے نظر آرہے تھے جو بے لوث ہو کر رسمیں ادا کرنے میں انکی مدد کرتے رہے رات بھر لوگ کام میں جٹے رہے۔لیکن موسمی حالات بے قابو ہو رہے تھے۔بارشیں برس برس کر دہشت مچا رہی

تھیں۔ان ہی حالات میں ببلی میکے سے وداع ہوئی۔اسکی سہیلیاں جو دوسری جاتی سے تھیں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دُعائیں دیتی رہیں۔

''یا اللہ۔ ببلی کو سُکھی سنسار دے۔ ڈھیر ساری خوشیاں دے۔"

وہ نم دیدہ ہو کر اُسکو جاتے دیکھ رہی تھیں۔شام کا سمے تھا اندھیرے گھنے ہو رہے تھے۔ببلی نے نئے گھر سنسار میں قدم رکھا تو اضطراب پھیل گیا۔لاوڈ اسپیکروں پر اعلان ہونے لگے۔

''محفوظ جگہوں پر چلے جاؤ۔ایک بڑا سیلاب آنے والا ہے"۔

کچھ دیر بعد پانی دہاڑتے دہاڑتے گھروں میں گھس آیا۔اور اپنے تھپیڑوں سے سب کچھ تہس نہس کر دیا۔

''یہ قیامت ہے۔"

چاروں طرف آوازیں آ رہی تھیں۔سب کو جان کے لالے پڑ گئے۔رامیش کی ماں بوکھلائی ہوئی بولی۔

''جنم جلی۔میں نے بیٹے سے کہا تھا۔کنڈلیاں نہیں ملتی ہیں۔اِس کو بیاہ کر مت لاؤ"۔

ایک سیلاب آیا جس نے آنکھ جھپکتے ہی ساری بستی کو اپنی گود میں سمیٹ لیا۔رامیش کی ماں رات بھر چلا چلا کر کہتی رہی۔

''یہ دلہن جنم جلی اور منحوس ہے۔یہ سیلابی دلہن ہے۔"

اور ببلی کے ساتھ "سیلابی" ہونے کا طعنہ ہمیشہ کے لئے جُڑ گیا۔ببلی پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔اور اس کا یہ رونا اس وقت بند ہو گیا جب سیلابی پانی کے اوپر اس کی لاش تیرنے لگی۔۔



بولتی تصویر

ایک میلی کچیلی بھیانک سی تصویر میرے خیالوں میں اُبھر کر آتی اور کڑوی کڑوی باتیں کہنے لگتی۔ میں ایک ساعت کے لئے حیران ہو جاتا۔ اور من ہی من میں سوچ لیتا۔

" کہیں یہ میرا وہم تو نہیں۔ بھلا ایک بے جان سی تصویر کیسے بول سکتی ہے؟''

مجھے بہ بظاہر اس کی باتیں سننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ یہ تصویر ایسی نہیں دکھتی تھی۔ جو میرے دل کو لبھاتی۔ اور میں مزے لے لے کر اس سے باتیں کرتا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی خراشوں کے نشان تھے۔ جنھیں دیکھ کر میرے دل میں کھلبلی سی مچ جاتی۔ آخر نفرتوں سے کٹ کر چار و نا چار میں نے اُسے پوچھا۔

''تمہارے چہرے پر یہ بدنما دھبے کیسے ہیں؟"

''یہ تمہارے ہی لگائے ہوئے دھبے تو ہیں"۔ اُسنے قدرے نرم لہجے میں جواب دیا۔

میں نے کرخت ہو کر کہا۔

''تم جھوٹ بولتی ہو۔ میں کسی کو زک پہنچانے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور ہاں۔ تم کون ہو۔ اور اسقدر بھیانک روپ دھارن کیوں کیا ہے"۔

میرے تجسس کی حدیں بیکراں سی ہوئیں۔ جس پر تصویر ٹھاہ ٹھاہ کر کے ہنسنے لگی۔ نہ جانے اس میں بولتے وقت یہ غیر معمولی قوت کہاں سے آجاتی تھی۔ میں

سوال پوچھے جا رہا تھا اور تصویر ہنستی جا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد یہ اچانک خاموش ہوگئی۔۔میں نے موقعہ غنیمت جان کر اُسے پھر پوچھا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ آخر تم ہو کون؟"

تصویر ٹکٹکی باندھے ایک بے جان بُت کی طرح اور دیکھے جا رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد اپنے ہونٹوں کو جنبس دیکر کہنے لگی۔

''تم جان کر بھی انجان کیوں بنتے ہو"۔

میں یہ سنکر اچنبھے میں پڑ گیا۔ قوس قزح کی مانند یہ تصویر بولتے وقت طرح طرح کے رنگوں میں اُبھر کر ست رنگی ہو جاتی۔ قوس قزح کے رنگ تو دل کو خوب لُبھاتے ہیں مگر جب تصویر عجیب عجیب رنگوں میں اُبھر کر ڈراونی لگتی۔ تو میں نے پوچھا۔

''تمہارے چہرے میں یہ قسم قسم کے رنگ کس نے بھر دیئے ہیں۔ تم بھیانک لگتی ہو"۔

وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی۔

''یہ سارے رنگ تم ہی نے تو رنگ دیئے ہیں"۔"

''میں نے"

''ہاں ہاں۔ تم نے"

''یہ سراسر تہمت ہے"۔

''ہرگز نہیں۔ یہ تمہارے ہی بھرے ہوئے رنگ ہیں"۔

" تم پھر جھوٹ بولتی ہو۔ مجھے نہ تو مصوّری آتی ہے اور نہ ہی تصویروں میں رنگ بھرنا ۔اگر یہ ہُنر آتا تو میں ضرور تم میں اپنا جیسا ہی رنگ بھر دیتا۔ انسان کا جیسا"۔

یہ تصویر طنزیہ انداز میں ہنسی بکھیرتے ہوئے مخاطب ہوئی۔

''انسان کا جیسا رنگ"۔ تم انسان ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔ تم میں کونسا انسانی

رنگ اب باقی ہے۔انسان تو انسانیت سے انسان ہے۔لیکن"

''لیکن کیا"۔میں نے بے صبری سے پوچھا۔"

تم نے تو انسانیت کو ہی شرمسار کر دیا"۔

''میں نے"

ہاں تم نے۔تم بھی تو انسان ہو"۔

''یہ کیا اناپ شناپ بولے جا رہی ہو۔میں نے انسانیت کو شرمسار کر دیا"۔

''ہاں۔تمہارے دل میں بے مروتی اور بے رحمی کے عنصر کلبلاتے نظر آتے ہیں۔تمہاری سوچ پر تعصب کی میلی چادر چڑھ چکی ہے۔تم نے اپنے ہمسایہ کے نیک اور سلیقہ مند بچوں کے بارے میں گندی گندی باتیں کیں۔اور انکے رشتے کو صلیب پر چڑھانے میں شرم تک محسوس نہیں کی۔چھی۔چھی۔چھی۔ان کے بارے میں تم نے اوچھے اوچھے بہتان باندھے۔یہ تہمتیں تراش کر تمہارے دل کو تسلی مل گئی ہوگی۔چغل خوری اور غیبت کرنا، کیا یہی انسانت ہے"۔

''اُف۔۔۔اُف۔خدا کے لئے اب یہ بکواس بند کر دو۔اور صاف صاف بتا دو۔تم آخر ہو کون"۔

تصویر پھر بولی۔"تم اپنی اصلیت جان لو۔آس پڑوس میں جو دل دہلانے والے واقعات رونما ہوتے ہیں۔تم ہی تو انجام دیتے ہو۔تم نے درندوں کی خصلت مستعار لی ہے۔تم اپنی تہذیب اور سماجی اقتدار کو تار تار کرنے کے درپے ہو۔تم نے اپنے پُر فضا ماحول کو جہنم بنا دیا ہے اب کوئی امن وسکون کے ساتھ یہاں گھوم پھر بھی نہیں سکتا۔اب تو روز ہی اس دھرتی کی مانگ میں خون کا سندور بھر دیا جاتا ہے یہ چرس، گانجے، افیون کے اڈے کس نے کھول رکھے ہیں آخر کیوں اس نوجوان پود کو نشیلی ادویات پلا پلا کر برباد کرنا چاہتے ہو۔اپنی ہی نسل کے ساتھ یہ گھناونا کھلواڑ کرنا

تمہیں زیب دیتا ہے۔" میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر کچھ لمحوں کے بعد تُند لہجے میں اُسے کہا۔

"تم ہٹو یہاں سے۔ تمہاری صورت بہت بدنما ہے یہ سارے کرتوت گن گن کر میرے ساتھ منسوب کرتی ہو۔ کیوں"

"یہ تمہارا ہی کیا کرایا ہے۔ تم جو انسان ٹھہرے۔ مجھے تم پر شرم آتی ہے۔ تمہیں یاد ہے۔ وہ معصوم دوشیزہ آسیہ۔ جو تمہارے اس بے درد سماج کے ہتھے چڑھ گئی۔ بڑے لارڈ پیار اور نازوں سے پالا تھا اس کو اپنے بابا نے۔ دونوں خوب کھیلا کرتے تھے۔ بابا اس کو اکثر کہتا۔

"تم میرا چاند ہو"۔

وہ کہتی۔ "پھر تو میں آسمانوں میں چلی جاؤں گی"۔

اس پر اُس کا بابا اس کے منہ پر انگلی رکھکر کہتا۔

"تم میرے آنگن کا چاند ہو۔ میں تمہیں آسمانوں میں جانے نہیں دونگا"۔

اور وہ اس کو بانہوں میں لے کر خوب بوسے دیتا۔ یاد آیا۔ اس کے بیاہ کی تاریخ بھی تو طے ہو چکی تھی۔ اب ہاتھوں میں مہندی لگنے والی تھی۔ لیکن افسوس! سیج چڑھنے سے پہلے ہی درندگی کا شکار ہوئی"۔

"ہاں۔ ہاں۔ وہ تو واقعی انسانی رُوپ میں درندے ہی تھے"۔

"بے چاری کے جواں سال ارمانوں کا قتل ہوا۔ اور تم خاموش بُت بنے بیٹھے رہے۔ کیسے ان درندوں نے اس معصوم کا آنچل میلا کر کے انسانیت کو شرمسار کر دیا۔ عزت و آبرو کے پرخچے اُڑا دیئے۔ وہ معصوم تو چلا چلا کر اپنی جان کی امان مانگتی رہی۔ لیکن انسانی روُپ میں درندوں نے گدھ کی طرح اسکی بوٹی بوٹی نوچ کر اسے بے رحمی سے مار ڈالا۔ وہ تو دلھن کا جوڑا بنوانے گئی تھی۔ انسانوں کی بستی میں

انسان محفوظ نہیں ہے۔چھی۔۔چھی۔۔چھی۔"

''دیکھو! مجھے بھی اس دل دہلانے والے واقعے کا افسوس ہے۔لیکن میں کر بھی کیا سکتا ہوں میں ایک کمزور انسان ہوں"۔

''کیوں ان درندوں کے خلاف آواز بلند کر کے انھیں کیفر کردار تک تو پہنچا سکتے ہو۔"

''نہیں۔نہیں۔وہ خطرناک لوگ ہیں انکے سامنے سب کی گگھی بندھ جاتی ہے"۔

''مگر اس دوشیزہ کو انصاف کون دلائے گا۔اس کی روح تڑپ تڑپ کر چلا رہی ہوگی۔''

''مجھے انصاف دو۔مجھے انصاف دو"۔

اور پھر اچانک یہ تصویر چیخ چیخ کر رونے لگی۔اپنے عریان جسم سے چھینا جھپٹی کرنے لگی۔میں نے دلاسہ دے کر کہا۔

''ان درندوں کو سزا ضرور ملے گی۔تم یہ رونا دھونا بند کر دو۔مجھے بتا دو۔تم ہو کون۔"

''میں تمہاری ہی تصویر ہوں۔تمہارے حال کی"۔

پھر زور زور سے ہنسی بکھیرتے ہوئے غائب ہوگئی۔اتنے میں کوئی معصوم سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔اور ایکدم سے میری آنکھ کھل گئی۔میرے سامنے میری ننھی سی بیٹی دوائی اور پانی کا گلاس ہاتھوں میں لئے کھڑی تھی۔

''دوائی لے لو پاپا۔آپ کو جلد افاقہ ہو جائے گا"۔

میں پسینے میں تر بہ تر بہت گھبرایا ہوا تھا۔میں نم دیدہ اپنی بیٹی کو کچھ دیر تک تکتا رہا۔پھر اُس کو اپنی بانہوں میں لیکر پاگلوں کی طرح بوسے دیتا رہا اور اس کے گول

مٹول چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیکر اسے کہا۔

''تم میرا چاند ہو۔"

وہ توتلی زبان میں بولی۔

"پاپا پھر تو میں آسمانوں میں چلی جاؤں گی۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور میں من ہی من سوچتا رہا۔

''ہاں۔۔۔۔ہاں۔اب تو وہی ایک جگہ ہے۔ جہاں تو محفوظ رہ سکتی ہو"۔

''اور میں نے ایک ہی جست میں اُٹھ کر اپنے ہاتھ میں خنجر لے لیا۔

☆☆☆

ٹائم ٹیبل

وہ پریشان حالت میں اسکول کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ دوپٹے میں کئی گانٹھیں پڑگئی تھیں جو سر سے سرک کر کندھوں پر انگوروں کے گچھے کی طرح جھول رہا تھا بال بکھرے بکھرے سے تھے اور قریب قریب سارے سفید ہو چکے تھے۔ ماتھے کی جُھریاں بھی دور سے ہی دکھائی دے رہی تھیں یوں محسوس ہورہا تھا کہ جسم آرام کا تقاضا کر رہا ہے۔ مگر۔۔ اُس کی کہانی تو اُس کے حُلیے سے ہی بیان ہورہی تھی وہ ہانپتے ہانپتے چلی آرہی تھی بشارت سر بڑے انہماک کے ساتھ اُس کو آتے دیکھ رہا تھا اور زندگی کے فلسفے کو سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اتنے میں سائرہ بی بی اس کے قریب پہنچ گئی۔ اور زمین پر پاؤں پسارے بیٹھ کر زور زور سے واویلا کرنے لگی۔

"ماسٹر جی، منّی گھر نہیں آئی۔ میں کیا کروں۔ کون سا مُنہ لے کر گھر جاؤں۔ بہُو کو کیا جواب دوں۔"

پھر وہ اپنے بالوں سے کھینچا تانی کرنے لگی۔ بشارت سر نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"مُنی گھر نہیں آئی۔ کس جماعت میں پڑھتی ہے"

"ارے بیٹا۔ وہ نرسری میں پڑھتی ہے۔ ائمن نام ہے۔"

اتنے میں دوسرے اساتذہ بھی ارد گرد جمع ہوگئے۔

"آپ اندر آفس میں آیئے"

ایک میڈم سہارا دیکر اُس کو اندر لے آئی۔

''آپ آرام سے بیٹھ جایئے۔اب بتایئے کیا بات ہے''

بشارت سر نے پھر پوچھا۔

''ارے بیٹا۔مُنی اسٹاپ پر نہیں اُتری۔میں بہت پریشان ہوں۔وہ کہاں گئی ہوگی'' میڈم نے پانی کا گلاس لا کر کہا۔

''پانی پیجئے'' اُسنے پانی کا گلاس ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اُتارا۔

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے مُنّی کی آنکھ لگ گئی ہوگی اس لئے اسٹاپ پر نہیں اُتری ہوگی۔آپ بے فکر ہو کر گھر جایئے وہ گھر پہنچ جائے گی' بشارت سر نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

سائرہ بی بی ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کرنے لگی۔

''بیٹا منی میرے ساتھ ہی گھر جانی چاہیئے نہیں تو بہو آسمان سر پر اُٹھائے گی۔میرا قافیہ تنگ کردے گی۔''

''آپ ضعیفی میں ہیں آپ کو خود نہیں آنا چاہیئے تھا''

''بیٹا وہ تو سویرے نکلتے ہیں گھر کی دیکھ بھال تو میرے ہی ذمّے ہے''

''آپ تو بزرگ ہیں اس عمر میں آپ گھر کی دیکھ بھال کریں۔زیب نہیں دیتا ہے''

وہ مصنوعی ہنسی بکھیرتے ہوئے بولی۔

''کیوں بیٹے۔۔مجھے کیا ہوا ہے میں تو ہٹی کٹی ہوں۔کام کرنے سے تھوڑے مر جاؤں گی''

اس کی باتوں سے اس کی بے بسی صاف صاف جھلک رہی تھی زندگی کے اس پڑاؤ پر اکثر بزرگ لاچاری کے ایام گزارتے نظر آتے ہیں۔جس گھر کو تنکا تنکا اکٹھے

کر کے تعمیر کرتے ہیں اُس گھر کا بستر بھی کانٹوں کی سیج لگتا ہے وہ بچے جن کو پیدائش سے ہی بڑے نازوں سے پالتے ہیں وہیں سرپھرے ہو جاتے ہیں اور تکالیف دیتے ہیں جن کی انگلی پکڑ کر بچے چلنا سیکھتے ہیں اُن ہی سے بے رخی کیوں۔؟

سائرہ بی بی کئی برسوں سے بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی اُس کے خاوند کی موت کے بعد اُس کی دنیا ہی جیسے اُجڑ کر رہ گئی۔ جس گھر کی وہ مالکن تھی اب اُسی گھر کی دیواریں اُسے سونی سونی سی لگتی تھیں اُسے جیسے سارے اختیارات چھین لئے گئے ہوں اب اُس کے گھر میں اُس کی کوئی نہیں سنتا۔ اب وہ اپنے ہی گھر میں کام کرنے والی مشین کی مانند ہوگئی تھی وہ گھر کے سارے کام کرتی اور ہمت حوصلے کے ساتھ ہر ایک چیز کا مقابلہ کرتی رہتی۔ کچھ توقف کے بعد بشارت سر تلملا کر بولا۔

''ماں جی مجھ سے آپ کی حالت دیکھی نہیں جاتی آپ میرے ساتھ چلئے''

میڈم اُس کا دوپٹہ سر پر رکھ کر اُسے باہر لے آئیں۔ اور کار میں بٹھا دیا۔ سائرہ بی بی نے میڈم کو ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ بشارت سر کار کو تیز چلاتے ہوئے سکول بس کے تعاقب میں نکل پڑا اور کچھ ہی منٹوں میں دونوں بس تک پہنچ گئے۔ بس آخری اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ کار کھڑی کر کے وہ دونوں اُتر گئے اور ہانپتے ہانپتے بس میں چڑھ گئے بس کی ایک ایک سیٹ چھان ماری۔ مگر منّی کہیں نظر نہیں آئی۔ بشارت سر نے اُس کو دلاسہ دیکر سیٹ پر بٹھا دیا اور کہا۔

''آپ آرام سے بیٹھ جایئے'' وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ سائرہ بی بی چھاتی پیٹنے لگی۔

''ہائے میری منّی ۔۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ میری منّی کو لے آؤ''

بشارت سر ڈرائیور کی تلاش میں اِدھر اُدھر تاک جھانک کرنے لگا جو پاس ہی ایک ڈھابے میں منہ سے چائے کی لمبی لمبی چسکیاں لے رہا تھا اور وہاں موجود

لوگوں سے ہنسی مذاق کی باتیں کررہا تھا بشارت سر تیز تیز ڈگ بھرتے ہوئے اُس ڈھابے کی طرف چل پڑا اور ڈرائیور کو آواز دی۔ ڈرائیور اس کو دیکھ کر چونک سا گیا اور بینچ سے اُٹھ کر تیز تیز اُس کی طرف لپک کر بولا۔

''بشارت صاحب آپ یہاں۔ خیریت تو ہے''

بس کی طرف جاتے ہوئے بشارت سر نے اُسے پوچھا۔

''وہ ملت کالونی کے سارے بچے اسٹاپ پر اُتر گئے تھے کیا''

''ہاں صاحب میں نے سب بچوں کو ڈراپ کیا۔

''آخر وہ گئی کہاں۔ کہیں کسی نے اُس کو اغوا تو نہیں کیا''

اِس کے دل میں طرح طرح کے خدشات پیدا ہونے لگے۔ مگر وہ سائرہ بی بی کو بدستور حوصلہ دیتا رہا۔

''آپ فکر نا کریں۔ وہ گھر پہنچ گئی ہوگی''

اُس نے سائرہ بی بی کو پھر کار میں بٹھا دیا اور ملت کالونی کی طرف بڑی تیز رفتاری کے ساتھ نکل پڑا۔ کچھ ہی منٹوں میں وہ وہاں پہنچ گئے۔ منّی گھر کے صحن میں مزے سے جھولا جھول رہی تھی اور کچھ گا بھی رہی تھی۔ سائرہ بی بی پر نظریں پڑتے ہی اُس نے زور سے آواز دی۔

''دادی آگئی۔ دادی آگئی۔''

سائرہ بی بی تیز تیز قدموں سے گئی اور اُس کو گلے سے لگا لیا۔ کچھ پلوں کے لئے اُس کو چومتی رہی۔

''میری بچی۔۔ تو نے تو میری جان ہی نکال دی تھی تو کہاں گئی تھی''۔

''دادی آپ کسی سے باتیں کر رہی تھی تو میں چپکے چپکے نکل گئی''

منّی نے ہنستے ہنستے جواب دیا پھر تالیاں بجا کر دادی کو چڑانے لگی۔

''شریر کہیں کی آؤ میں تیرے کان کھینچتی ہوں۔''

مّنی نے زور سے چیخا۔تو اندر سے بہو دوڑتی ہوئی آئی اور غصّہ بھرے لہجے میں بولی۔

''ماں جی آپ کو شرم آنی چاہیے ایک تو مّنی کو اکیلا سڑک پر چھوڑا تھا اُوپر سے اس کو تنگ کر رہی ہو۔جا کے اپنا کام کرو۔''

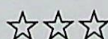
یہ سن کر بشارت سر کے پاؤں تلے زمین کھسکنے لگی۔وہ بہت پریشان ہو گیا اور دم توڑتی انسانی قدروں کے بارے میں غور سے سوچنے لگا کیوں کہ وہ بھی اسی سماج میں رہ رہا تھا جہاں بہوئیں قیمتی زیورات عمدہ عمدہ سُوٹ زیب تن کئے پلنگوں پر آرام کرتی رہتی ہیں اور گھر کے بوڑھے بزرگ گھر کا کام کاج سنبھالتے رہتے ہیں۔وہ ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ آنگن میں دانہ چگتے پرندے پھُر سے فضا میں اُڑ گئے۔وہ ان کو کچھ پل اُڑتے دیکھتا رہا اور وہ اُڑتے اُڑتے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے، اتنے میں مُنی نے اونچی آواز میں کوئی نظم پڑھنا شروع کی۔بشارت سر چونک سا گیا اُس نے سائرہ بی بی کو اُسی جگہ پر بے سُدھ سی حالت میں دیکھا وہ اُس کے پاس جا کر کچھ بولنے ہی والا تھا کہ سائرہ بی بی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا سا کاغذ نکال کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیا اور نم دیدہ دیکھتی رہی۔

''یہ کیا ہے ماں جی۔'' اُسنے پوچھا۔

''وہی جو آپ اپنے لئے اسکول میں بناتے ہو۔''

اُسنے بڑے غور سے کاغذ کو دیکھا اور کچھ دیر بعد بے ساختہ اُس کے لرزتے ہونٹوں پر آیا۔

''ٹائم ٹیبل''



گھر آنگن ویرانی

وہ کئی برسوں سے اُن جڑواں بچوں کو پیار سے پال رہی تھی بچے بہت خوبصورت تھے ۔اُن کی صورتیں بہت ملتی جُلتی تھیں گول گول آنکھیں، گلابی رنگت کے چہرے، کالے گھنے بال اور قد۔۔۔قد میں بھی ذرا برابر فرق نہیں ۔وہ جب اسپتال میں پیدا ہوئے تھے تو خوشی کے مارے سب کی باچھیں کھل گئی تھیں خاصکر عبدالمجید خوشیوں سے پھولے نہیں سمار ہا تھا اُسنے اسپتال میں موجود لوگوں میں خوب گلاب جامن اور رس گولے تقسیم کروائے کیونکہ شادی کے دس سال گزر جانے کے بعد اُسے اتنی بڑی خوشی نصیب ہوئی تھی اس سارے عرصے کے دوران اُس پر ہزار مرتبہ بیوی کے بھانج ہونے کا شک گزرا لیکن کبھی یہ بات زبان پر لاکر بیوی کی دل آزاری نہیں کی وہ بہت ہی سلجھا ہوا آدمی تھا۔

اُس مبارک گھڑی پر فریحہ ماسی بھی اسپتال میں موجود تھی جس کا گھر اُسی بستی کے اغل بغل میں تھا جہاں عبدالمجید اور اُس کی بیوی رہتی تھی فریحہ ماسی کئی برسوں سے گھر میں اکیلے رہتی تھی جس کی ایک الگ کہانی ہے۔اُس کو بستی میں سبھی ماسی کہہ کے پکارتے تھے اُس نے اسپتال میں جب ان ننھے منے بچوں کو ہاتھوں میں لے کر جھولا جھلایا تو بچوں کے ہونٹوں پر تبّسم کھلتے دیکھ کر اپنی بہن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”میں نہ کہتی تھی کہ اللہ تمہاری گود پھول جیسے بچوں سے بھر دے گا۔ بڑے پیارے بچے ہیں اللہ نظر بد سے بچائے ۔“

فریحہ ماسی اب روز ہی اُن کے گھر جاتی اور ان بچوں کی دیکھ بھال میں اکثر وقت بتاتی ان بچوں کی کلکاریوں سے اُس کی زندگی میں رونق سی آ گئی تھی۔

ایک دن جب عبدالمجید اور اُس کی بیوی اپنے بچے فریحہ ماسی کے حوالے کر کے امن کی وادی میں گھومنے گئے تو لوٹ کر گھر واپس نہیں آئے۔ اُن کے بارے کچھ بھی پتہ نہ چلا البتہ اُن ہی دنوں یہ باتیں زبان زد عام ہوئی تھیں کہ امن کی وادی میں کسی دیو پیکر ظالم انسان نے شاہی تخت پر قبضہ کر لیا ہے جو لوگوں پر بے حد ظلم ڈھا رہا ہے لوگ اس ظالم بادشاہ کے حکم کے مطابق ہی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اور اگر کوئی حکم عدولی کرتا ہے تو اُسے قید با مشقّت کی سزا سنائی جاتی ہے۔ اُس ظالم نے لوگوں کو دانے دانے کے لئے محتاج بنا دیا تھا لوگ ڈر اور خوف کے سایے میں گھٹ گھٹ کر جی رہے تھے فریحہ ماسی کو اپنوں کے بچھڑنے کا غم بہت ستا رہا تھا مگر بھولے سے بھی وہ اس کا ذکر بچوں کے سامنے نہیں کرتی اُس نے اپنے غموں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں میں دفنا کے رکھا تھا۔ بچے جب کبھی اُس سے پوچھتے۔

''ہمارے مما پاپا کون ہیں''

اس پر وہ لمبی آہ کھینچ کر اُن سے کہتی۔

''میں ہی تمہاری مما ہوں اور میں ہی تمہارا پاپا ہوں''

فریحہ ماسی کی باتوں پر دونوں خوب ہنستے۔ ایک دوسرے کو مکے مارتے ہوئے اس مکالمے کو بار بار دہراتے۔ پھر کوئی ایک اُس کا دوپٹہ کھینچ کر کہتا۔

''تمہارے اتنے لمبے لمبے بال ہیں لمبے لمبے بال تو عورتوں کو ہوتے ہیں مردوں کے بال چھوٹے ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے۔ تم مما اور پاپا دونوں نہیں ہو سکتی''

بچے اب بارہ سال کے ہو گئے تھے وہ خوب شرارتیں کرتے رہتے فریحہ ماسی بھی اُنھیں ہنستے کھیلتے دیکھ کر منوں بھاری ہو جاتی۔ وہ بچوں کو بڑا لارڈ پیار کرتی۔ اُن کی

چھوٹی سے چھوٹی فرمائش بھی پورا کرتی اُسے فیملی پنشن کے کچھ ہزار روپے ماہوار ملتے تھے جن سے گھر کا سودا سلف خریدتی ۔لیکن بچوں کے تعلیمی اخراجات پورا کرنے کے لئے وہ پڑوس کے کچھ دفتری بابوؤں کے گھروں میں جا کر کام کرتی ۔اور بچوں کو اس بات کی کانوں کان خبر نہیں ہونے دیتی ۔بچوں کو اسکول روانہ کرتے ہی وہ کام پر چلی جاتی ۔اور کچھ گھنٹے کام کرنے کے بعد فوراً ہی گھر لوٹتی ۔

ایک بار طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے بچے اسکول نہ جا سکے ۔وہ گھر پر ہی تھے کہ پڑوس والی ایک عورت نے آکر فریحہ ماسی پر بہت غصّہ کیا ۔اور کہا ۔

''لمحہ بھر میں کام پر نہ آئی تو ہم کسی اور کو کام پر مامور کر دیں گے''

اور فرش پر زور سے پاؤں مارتے ہوئے چلی گئی ۔بچے ٹکٹکی باندھے کچھ دیر تک فریحہ ماسی کو تکتے رہے ۔پھر سوچتے ہوئے اُس کی جانب بڑھ گئے اور پہلو میں بیٹھ کر ایک نے کہا ۔

''ماسی اس عورت نے تمہاری بہت تحقیر کی ۔مجھے بہت بُرا لگا ۔''

دوسرے بچے نے کہا ۔

''ماسی ہم کیا مر گئے ہیں جو تم چُپکے چُپکے دوسروں کے گھروں میں جا کر کام کرنے لگی ہو ۔یہ ہماری غیرت پر دھبّہ ہے آئیندہ خیال رہے''

پہلے والے نے پھر غصّہ آمیز لہجے میں کہا ۔

''ماسی میں نے اُس کے منہ پر پتھر دے مارا ہوتا اور ڈائن سال بھر بات نہیں کر پاتی ۔۔لیکن بزرگی کا لحاظ کیا ۔اور ہاں اب ہم خود کام کریں گے''

فریحہ ماسی نے بچوں کو بازوؤں میں لے کر خوب بُوسے دیئے پھر نم دیدہ ہو کر روہانسی آواز میں بولی ۔

''میرے بچو !تم ننھے ننھے پھولوں کی طرح ہو ۔تمہاری خوشبو سے میرا گھر مہک

رہا ہے تمہارے ہاتھ گلاب کے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح نازک اور کومل ہیں تم کوئی کام وام نہیں کرو گے۔ بس من لگا کر پڑھائی کرو“

اس پر دونوں بچے یک زبان ہو کر بول پڑے۔

”ماسی جی ۔۔ ماسٹر جی کہتے ہیں کہ کام عبادت ہے اور ہم دونوں کام کریں گے ۔کوئی تمہاری تذلیل کرے یہ ہم سے برداشت نہیں ہوگا“

فریحہ ماسی من ہی من میں سوچنے لگی۔

”ان کے آنے سے میرے گھر میں کتنی رونق آ گئی میں ان کی تعلیم کسی بھی صورت میں متاثر ہونے نہیں دوں گی یہ میرے ویران آنگن کے پھول ہیں میں ان کو مرجھانے نہیں دوں گی“

پھر کچھ توقف کے بعد بچے اُٹھ کر سیدھا کباڑ کی دکان پر چلے گئے اور رشید کباڑیا سے کہا۔

”رشید چاچا ہمیں بوریاں دو ہم کباڑ کی چیزیں جمع کر کے دیں گے۔ چاچا ہمیں پیسوں کی سخت ضرورت ہے“

اس طرح سے انھوں نے کباڑ جمع کرنے کا کام شروع کیا۔ اور بوریاں کندھوں پر اُٹھا کر گلی گلی گھومنے لگے وہ پلاسٹک کی بوتلیں، ٹین کے ڈبے، پرانے جوتے جمع کرتے اور رشید کباڑیا کو بیچ دیتے۔ کباڑ کی چیزوں سے حاصل ہونے والے روپے جب انھوں نے فریحہ ماسی کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا۔

”لو۔ ماسی اب اچھے دن آئیں گے“

یہ روپے دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئی اور اُس کے دل میں طرح طرح کے خدشات اُبھرنے لگے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ بچوں نے اُسے جھنجھوڑ کر کہا۔

”ماسی کہاں کھو گئی ہو۔ یہ ہمارے خون پسینے کی کمائی ہے ہم نے کباڑ جمع کرنے کا

کام کرنا شروع کیا ہے''

فریحہ ماسی ان پر برہم ہوگئی انھیں کئی تھپڑ رسید کئے پھر انھیں گلے سے لگا کر زار زار رونے لگی اور روتے روتے ان سے مخاطب ہوکر بولی۔

''تمہاری مما نے تم لوگوں کے لئے بڑے بڑے خواب سجائے تھے وہ کہتی تھی انھیں پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنا دوں گی اور تم نے کباڑ کی بوریاں ہاتھوں میں اُٹھالی ہیں نالائقو۔ اگر دوبارہ ایسی حرکت کی تو میں بہت ماروں گی''

یہ سنتے ہی بچوں کی آنکھوں سے آنسوں چھلکنے لگے اور کچھ دیر تک سسکیاں لے لے کر روتے رہے۔ پھر ایک دم سے اُٹھ کر چیختے چلاتے کمرے میں دیوانہ وار پھرتے رہے اور فریحہ ماسی سے گڑگڑاتے ہوئے بولے۔

''ماسی آخر سچ سامنے آ ہی گیا۔۔ ماسی بتا دو ہمارے مما پاپا کون ہیں''

بچوں کے بے حد اصرار پر اُس نے سارا ماجرہ سنا دیا۔ وہ اپنے مما پاپا کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہوگئے۔

''ماسی ہم اُنھیں اُس ظالم بادشاہ کے چنگل سے ضرور چھڑا کر لائیں گے اُس ظالم کی غلامی سے سب کو آزاد کرالیں گے''

اور دونوں خُوبرو بچے رخت سفر باندھ کر امن کی وادی میں پھر سے امن کے جھنڈے گاڑنے کے لئے چل پڑے۔ فریحہ ماسی اُنھیں سمجھاتی رہی۔

''میرے بچو مت جاؤ''

وہ کبھی ایک کو پکڑتی، کبھی دوسرے کو۔ لیکن بچے تیز بہتے پانی کی طرح منزل کی طرف رواں دواں ہوئے وہ سینہ کوبی کرتی رہی۔

''میرے بچو! رُک جاؤ اس گھر آنگن کو ویران کر کے مت جاؤ۔''

یہ کہتے ہوئے ہوا میں معلق ہوکر اُس کی سانس اٹک گئی۔ ☆☆☆

سمٹتے دائرے

وہ مین گیٹ کی آڑ میں رہ کر بڑی بے صبری سے اُس کا انتظار کرتی اور اپنی نظریں مکان کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر بچھائے رکھتیں۔سڑک جس پر لمحہ بھر کے لئے بھی گاڑیوں کی آمدورفت مسدود نہیں ہوجاتی۔آتے جاتے یہ گاڑیاں شور شرابے سے ماحول کو آلودہ کردیتیں اور زور سے ہارن بجاتے ہوئے گزرجاتیں۔آس پاس کے مکین روز ہی اس صورت حال سے دوچار ہوجاتے روز ہارن بجنے کی طرح طرح کی آوازیں انھیں سنائی دیتیں اتنے سخت شورشرابے کے بیچ بھی خالدہ ہمت جٹا کر کھڑی رہتیں اور احمد کے آتے ہی اُس کے قدموں کی چاپ دُور سے ہی سن لیتی اُس پر نظر پڑتے ہی اس کے آنگن میں جیسے بہار آجاتی۔وہ کلیوں کی طرح چٹک کر کھل اٹھتی۔

احمد کو روز ہی اُس سڑک سے گزرنا پڑتا تھا اور روز ہی خالدہ بھی اس تاک میں رہتی کہ کب آئے۔احمد کو دیکھتے ہی وہ ہشاش بشاش ہوجاتی۔وہ اُسکو کھلا پلا کر بہت سکون محسوس کرتی۔اُس روز احمد گلی کی نکڑ سے نکل کر تیز تیز ڈگ بھرتے ہوئے جب مین گیٹ کے بالکل نزدیک پہنچ گیا تو خالدہ ایک ہی جست میں اُس کے سامنے دیوار کی طرح کھڑی ہوگئی اور اُس کے چہرے کو ہاتھوں میں لئے کچھ دیر تک تھپ تھپاتی رہی۔ پھر کندھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''احمد۔۔تمہاری طبیعت ٹھیک تو ہے نا۔''

''جی۔میں۔بالکل ٹھیک ہوں۔''

اُسنے رک رک کر کہا۔خالدہ نے مزید استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم کل کہاں تھے۔مجھے بہت پریشان کردیا۔''

''جی وہ ہلکا سا بخار آیا تھا ابو نے آرام کرنے کو کہا۔وہ رات دیر تک ماتھے پر پٹیاں بھی باندھتے رہے۔دوتین گولیاں بھی کھائیں۔پھر طبیعت ٹھیک ہوگئی''۔

خالدہ اُس کے معصوم چہرے پر نظریں جماتے ہوئے من ہی من میں سوچتی رہی۔

''یہ گردش ایام بھی انسان کو کیا کیا رنگ دکھلاتا ہے۔خالق رحمانی حکم دینا جانتے تھے اُسکی بیوی سیدھی سادی،نیک دل بڑی فرمانبرداری کے ساتھ احکامات بجا لاتی۔اُف تک نہیں کرتی۔مگر اُس کی بے وقت کی موت نے ہنستے کھیلتے گھر کو ماتم کدے میں بدل ڈالا۔خالق رحمانی کی دنیا ہی ہلا کر رکھ دی۔وہ ان ہی سوچوں میں تھی کہ احمد نے آواز دیکر کہا۔

''جی میں چلوں۔''

وہ ایک دم سے چونک کر بولی۔

''بالکل نہیں'' وہ احمد کو اندر لے گئی۔اور دونوں صوفے پر بیٹھ کر کچھ دیر تک ایک دوسرے کو متجسسانہ انداز میں دیکھتے رہے۔پھر خالدہ کیچن میں جا کر ایک دودھ کا گلاس لے آئی۔اور محبت بھرے انداز میں بولی۔

''دودھ پیو۔یہ تمہاری صحت کی نشو ونما کے لئے ضروری ہے''

''جی اچھا'' اُسنے دودھ پی کر گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔اتنے سے خالدہ کے دل کو تسلی نہیں ملی اُسنے ٹرے میں تازہ پھل لا کر احمد کے سامنے رکھ دیے۔۔کہا۔

''تمہارے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی ہے یہ پھل کھالو''

احمد نے پھل کھا کر جانے کے لئے اصرار کیا۔خالدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اپنا خیال رکھنا''

اور وہ تیز تیز قدم اُٹھا کر نکل گیا۔خالدہ اُس کو تب تک دیکھتی رہی جب تک نہ وہ اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔خالدہ کے گھر میں سب کچھ موجود تھا۔وہ صاحب ثروت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی فیاض بھی تھی۔کسی کو کسی چیز کی حاجت پڑ جاتی تو وہ بلا تامل حاجت روا کرتی۔کسی بھی معاملے میں بخل نہیں برتتی۔یہی وجہ تھی کہ اُس کے گھر میں لوگ آتے جاتے رہتے۔چھوٹے بڑے' غریب' فقیر۔وہ سب کو کھلاتی' پلاتی۔گویا اس کا گھر لنگر بن گیا تھا۔وہ گھر کی مالکن تھی اور گھر میں اُسی کا حکم چلتا۔ہر ایک کام اُسی کی منشا کے مطابق ہی ہو جاتا۔وہ احمد کے بارے میں ہر وقت پریشان رہتی۔بار بار اُسی کے بارے میں سوچتی رہتی۔

''ماں بھری جوانی میں ہی خدا کو پیاری ہوئی۔بے چارہ کم سنی میں ہی یتیم ہو گیا۔جبھی سے لوگ اس کو طعنے دیتے رہے۔

''آتے ہی ماں کو کھا لیا''

خالدہ کو یہ بات ناگوار گزرتی اور وہ لوگوں کو ٹوکتی رہتی۔کئیوں سے کئی بار تُو تُو میں میں بھی ہوتی رہی۔

ایک دن وہ احمد کا انتظار کر رہی تھی۔احمد اس کی نظروں سے بچتے بچاتے نکل گیا۔ وہ سڑک کے کنارے بڑی بے صبری سے دائیں بائیں تاکتی رہی۔اس نے احمد کے دوستوں سے پوچھ لیا۔سب نے ایک ہی جواب دیا۔

''وہ چلا گیا''

خالدہ آگ بگولہ ہوئی۔اُس کے دل میں اضطراری کیفیت پیدا ہوئی۔وہ احمد کو

تلاش کرتے ہوئے اُس کے پاس پہنچ گئی۔ یہ دیکھ کر وہ حیران ہوگیا۔اور اندر ہی اندر خود کو دھتکارنے بھی لگا۔ وہ شرمندگی میں سر جھکائے ہکلاتے ہوئے بولا۔

''آپ یہاں''

خالدہ نے بھرپور نظروں سے دیکھ کر اُسے کہا۔

''تم نے آج پھر پریشان کر دیا۔ یہ کیا تماشہ ہے احمد''

احمد نے دبی زبان میں کہا۔

''جی وہ۔۔آج ایک دوست کی گاڑی میں چلا آیا۔آئندہ محتاط رہوں گا''

''یہ حیلے بہانے مت بناؤ۔ آئیندہ ایسی حرکت کی تو بڑی سے بڑی۔۔۔۔۔!

اُس نے ہاتھ ہوا میں اُٹھایا ہی تھا کہ فرش پر رکھا ہوا تھیلا پاؤں لگنے سے ہل گیا اور اُس سے کچھ آواز آئی۔اُس کی نظریں دودھ کے گلاس پر پڑ گئیں جو وہ احمد کے لئے لائی تھی۔اُس نے دودھ کا گلاس احمد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لو آرام سے پیو۔اور ہاں اب کی بار میں نے معاف کیا۔ دوبارہ ایسی حرکت کی تو بڑی سے بڑی سزا دوں گی۔''

وہ کچھ دیر ڈبڈباتی آنکھوں سے اُسے تکتی رہی پھر سامان سمیٹ کر چل پڑی۔خالدہ کی بے پناہ ہمدردی اور شفقت دیکھ کر اُس پر عجیب سی کیفیت طاری ہوئی اُس کے بدن میں جیسے سوئیاں چبھنے لگیں۔ وہ اندر ہی اندر خود کو کوستا رہا۔اُسنے اپنے کان پکڑ لئے اور دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنے کی قسم کھائی۔ پھر وہ وہاں روز ہی جاتا اور روز ہی خالدہ بھی اُس کو دودھ کا گلاس پلاتی رہتی۔ وہ خوب باتیں کرتے۔اب احمد بھی بے تکلف ہو کر اُس سے بحثیں کرنے لگا تھا خالدہ نے باتوں باتوں میں اُسے کہہ دیا کہ گھر میں شادی ہو رہی ہے۔ یہ سنکر وہ گہری سوچ میں پڑ گیا قدرے تجسس بھی بڑھ گیا۔لیکن نہ جانے کیوں اُس نے خالدہ سے پوچھنے میں احتراز کیا۔ وہ بدستور

سوچوں میں غرق رہا۔' کہیں چھوٹے بابو کی شادی تو نہیں ہو رہی ہے پھر تو اس گھر کی کایا ہی پلٹ جائے گی۔ وہ ٹھہرے عاشق مزاج۔ وہ بیوی کی ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہیں دیں گے اوپر سے آج کل کی بہویں بہت زیادہ نازک مزاج ہوتی ہیں ہاتھوں کو گرد تک لگنے نہیں دیتیں جو اپنے لئے نوالہ نہ بنا سکے۔ وہ اوروں کو کیا کھلائیں' کیا پلائیں۔ پھر تو اس گھر کے ٹھاٹ ہی بدل جائیں گے۔ اور وہ اکثر اس گھر کے بارے میں سوچتا رہتا۔

پھر ایک دن اُس نے گھر میں بڑی گہما گہمی دیکھی۔ تقریباً دس مزدور گھر میں کام کر رہے تھے کچھ مکان کو پینٹ تو کچھ فرش اور آنگن کی صفائی' ستھرائی کر رہے تھے' کچھ بالن اکٹھا کر رہے تھے۔ خالدہ بھی مستعدی کیساتھ انھیں ہدایت دے رہی تھی اُس کے چہرے سے خوشی کی لہریں پھوٹ رہی تھیں احمد پر نظر پڑتے ہی اُس نے دودھ کا گلاس لاکر سامنے رکھ دیا اور اُس سے بولی۔

''چلو..جلدی پیو''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ اس گہما گہمی کے ماحول میں احمد کچھ پل کے لئے کھو سا گیا پھر ادھر ادھر تاک جھانک کرنے لگا۔ گھر میں نئے صوفے' کرسیاں دیکھیں' نئے قالین دیکھے۔ آخر وہ خالدہ سے پوچھ ہی بیٹھا۔

''جی وہ۔ سچ مچ میں چھوٹے بابو کی شادی ہو رہی ہے کیا؟

اسنے نے بڑے غور سے دیکھ کر کہا۔

''ہاں بھئی۔ اس گھر میں بہو آرہی ہے''

''مگر بہو لانے کی اتنی جلدی بھی کیا تھی ابھی تو چھوٹے بابو زیر تعلیم ہی ہیں''

''احمد۔۔ جتنی جلدی گھر میں بہو آجائے' بہتر ہے مجھے تو فراغت ملے گی۔ بہو گھر کا کام کاج سنبھالے گی۔''

احمد نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

''مگر آج کی بہوئیں تو کام کرتی نہیں ہیں بس بیٹھے بیٹھے وزن بڑھاتی ہیں پھر ٹھیک سے چل پھر بھی نہیں سکتی ہیں اور ہاں گھر کی چابیاں بہو کے حوالے مت کرنا۔ پھر اپنا ہی گھر پرایا لگنے لگتا ہے۔''

''احمد یہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔اور ہاں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

احمد کو جنم دینے کے فوراً بعد اُس کی ماں چل بسی تھی اُس سمے خالدہ اُس کے سرہانے بیٹھی تھی۔دونوں میں کیا بات ہوئی آج تک خالدہ نے کسی پر ظاہر نہیں کی۔لیکن جبھی سے وہ احمد کا خیال رکھ رہی تھی احمد نے بات کو جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی کون سی تاریخ کو شادی ہو رہی ہے۔''

''بس تھوڑے دن رہ گئے''۔

''میں سوچ رہا تھا کہ گھر میں بہو آئے گی پھر روز روز یہاں آنا ٹھیک نہیں رہے گا کیا پتہ بہو کے کیسے مزاج ہونگے۔اب میں روز روز نہیں آسکوں گا۔''

''احمد اس گھر کی مالکن میں ہوں۔ یہاں ہر کام میری مرضی سے ہی ہوگا۔''

یہ سنکر احمد کو قدرے خوشی ہوئی مگر دل میں یہ ڈر بھی تھا کہ وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ پھر تھوڑے دنوں کے بعد چھوٹے بابو کی بارات دھوم دھام سے نکلی۔گھر میں شادیانے بجنے لگے۔عورتیں ناچنے گانے لگیں۔چاروں طرف رونق ہی رونق نظر آرہی تھی خالدہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی آخر بہو گھر میں آہی گئی رات دیر تک جشن کا سا سماں رہا۔نہ جانے کیوں احمد وہاں جانے سے کترانے لگا شادی کے بعد وہ ایک دو بار وہاں گیا پھر ایک دم سے اُسنے جانا ہی چھوڑ دیا۔

کچھ مہینے گزر گئے۔ پھر ایک دن احمد بے صبر ہو کر وہاں چلا گیا اور دروازے پر دستک دیتے ہی اندر داخل ہو گیا اُسنے بے ساختہ آواز دی۔

''خالہ۔۔۔ خالہ'' خالدہ کے کانوں میں آواز پڑتے ہی وہ بے صبری سے کمرے سے باہر آئی۔ احمد اسے لپٹ گیا اور نم دیدہ اُس کو کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر معصومانہ انداز میں کہا۔

'خالہ۔ مجھے دودھ پلاؤ نا''

''احمد تم اتنی دیر تک اپنی خالہ سے دور رہے۔ ایک بار بھی میری یاد نہیں آئی۔''

''خالہ وہ بات نہیں ہے۔ میں تمہیں بار بار یاد کرتا رہا ہوں مگر کچھ عجیب سی الجھن میں پھنس گیا تھا''

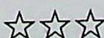
احمد نے پھر دودھ پلانے کے لئے کہا خالدہ اُس فرج کی طرف دوڑ گئی جس میں وہ احمد کے لئے دودھ رکھا کرتی تھی اُس نے بڑی جلدی میں فرج کا دروازہ کھولنا چاہا مگر چابی اُس کے پاس نہیں تھی۔ اُس نے تو چابیاں بہو کے حوالے کر دی تھیں وہ ٹوٹے قدموں واپس احمد کی طرف مڑی اُس کو دیکھتی رہی پھر بھرائی آواز میں گویا ہوئی۔

''احمد اب تم بچے نہیں رہے''

اتنے میں بہو کی کربناک آواز آئی۔

''رحمان۔ کہاں مر گئے سارے کے سارے۔ میرے لئے چائے لاؤ''

پھر خالدہ دوڑتی ہوئی کیچن میں چلی گئی۔ احمد کو یوں محسوس ہوا کہ خالدہ ایک ناکام کہانی ڈائریکٹر کی طرح اپنا سب کچھ لٹا کر پرانی کہانی ہو چکی ہے اور اس کی آزادی کے دائرے سمٹ چکے ہیں۔



کانچ کی دیوار

سڑک کے کنارے استادہ پرانے چنار کے سائے میں بیٹھ کر وہاں سے گزرنے والی چمچماتی کاروں کو غور سے دیکھتا اور من ہی من میں سوچتا ۔

''یہ کاریں بھی سڑک پر دوڑتی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہیں۔اب ان کی تعداد بھی قدرے بڑھ گئی ہے کبھی کبھی گمان ہوتا جیسے تاروں کا جھرمٹ سڑک پر اُتر آیا ہو اور شام کے وقت گاڑیوں کے بلب سے نکلنے والی نقرئی روشنی ہو بہ ہو تاروں کا منظر پیش کرتی''۔

نعمان کا دل بھی یہ سوچ کر بلیوں اُچھلتا کہ کچھ ہی سمے میں وہ بھی گاڑیوں کے دوڑتے بھاگتے جھرمٹ میں ایک عمدہ سی گاڑی کا اضافہ کرنے والا ہے۔اتنے میں ایک سرخ کار سائیں سائیں کر کے اُس کی نظروں سے گزری۔وہ بدستور سوچوں میں غرق رہا۔

''اس کار کا ڈیزائن بہت عمدہ ہے اور اندر جگہ بھی کشادہ ہے''۔

پھر سیاہ، سفید جو بھی کار سڑک سے گزرتی وہ اپنی رائے اس کے بارے میں اپنے دل کے کینوس پر اُتار کر محفوظ کر لیتا کبھی کسی کار کے رنگ اور ڈیزائن کی تعریف کرتا یا پھر سر کھُجا کر نا پسند کرتا۔نعمان کے دل میں کار خریدنے کی چاہ انگڑائیاں لے رہی تھی اور یہ بچوں کے اصرار پر اُس کے اندر جگ گئی تھی۔

وہ ایک بڑی سی کار خریدنا چاہتا تھا تا کہ وہ بھی اپنی سوسائٹی میں شان سے

رہے۔ گھر میں دانہ پانی ہو نہ ہو لیکن ٹھاٹ کے لئے گھر میں کار کا ہونا ضروری بن گیا ہے۔ اُس کے آس پڑوس میں مقیم تقریباً تمام لوگوں کے پاس عمدہ عمدہ کاریں تھیں وہ اپنی ہی کاروں میں تفریح پر چلے جاتے اور خوب مزے کرتے۔ اُن کے بچے جب کمیونٹی پارک میں کھیلنے جاتے تو وہ ان نئے نئے مناظر کا ذکر کرتے جو انھوں نے سیر سپاٹے کے دوران دیکھ لئے ہوتے تھے۔ نعمان کے بچے ان کے ساتھ کھیلتے ہوئے یہ ساری باتیں سن لیتے۔ اور انھیں کمتری کا احساس ہونے لگتا۔

اُس دن جب وہ پارک سے لوٹے تو اُن کے چہرے اُترے ہوئے تھے وہ سیدھے اپنے کمرے میں جاکر منہ بسورے بیٹھے رہے غالباً اس تاک میں تھے کہ کب کیچن سے آواز آئے اور انھیں اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کا موقعہ ملے کچھ وقت وہ یونہی کمرے میں مغز ماری کرتے رہے۔ جب کوئی آواز نہ آئی تو وہ شیر کی طرح غرا کر خود بہ خود کیچن میں آدھمکے اور یک زبان ہوکر بولے۔

''پاپا آپ کار کب خریدو گے۔ ہمیں روز دوستوں کی باتیں سننی پڑتی ہیں وہ ہمیں چڑانے کے لئے کبھی کبھی اشاروں کنائیوں میں باتیں کرتے ہیں۔''

''بچو! آپ کی مانگ پر عالم پناہ ضرور غور فرمائیں گے''۔

اُس نے بچوں کو حلقے میں لیتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا۔ اس پر ایک بچے نے گھورتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''پاپا اگر آپ سنجیدہ نہیں ہوئے تو میں دریا میں کود جاؤں گا ''

دوسرے بچے نے قدرے اور شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

''پاپا ہم بھی اپنی کار میں بیٹھ کر ننھیال جانا چاہتے ہیں مختلف مقامات کے سیر سپاٹے پر جانا چاہتے ہیں۔ کار خریدو۔ نہیں تو میں ۔۔۔۔۔؟

اور وہ جملہ نامکمل چھوڑتے ہوئے کیچن سے چلا گیا۔ اُس کے تعاقب میں دوسرا

بچہ بھی برتن فرش پر پٹخ کر چلا گیا بچوں کے غصیلے تیور دیکھ کر وہ ایکدم سے سوچ میں پڑ گیا اور بچوں کے پیچھے پیچھے ان کے کمرے میں جا کر انھیں سمجھانے لگا۔ مگر بچے ضد پکڑ کر اپنی بات پر ڈٹے رہے نعمان نے مصلحت آمیز لہجے میں لچک پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''بچو! میں کب سے کار خریدنے کے لئے فکر مند ہوں۔ خدا نے چاہا تو کار ضرور خریدیں گے۔''

نعمان نے اُن کے غصے کو بھانپتے ہوئے اپنے دل پر بڑا سا پتھر رکھ کر کہہ دیا۔ بچوں کے چہرے گلاب کی طرح کھل اُٹھے۔ ایک بچہ مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''پاپا ایک کانچ کی دیوار ہی تو پار کرنی ہے''

اُس کار سیل سینٹر میں سامنے سے شیشے کے بڑے بڑے پٹ لگا دیئے گئے تھے اور بچے سمجھتے تھے کہ اس میں کانچ کی دیوار لگا دی گئی ہے اور یہ دیوار پار کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ کیا جانے کہ اس دیوار کے اندر پڑی کاروں کو آنے جانے والے کیسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہ جاتے۔ بچے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''پاپا آج موقعہ پر ہی کاروں کی سیل ہوتی ہے۔ بس کچھ ہزار بھر دیجئے کار دوڑتی ہوئی آنگن میں آجائے گی''

پھر وہ اکٹھے کیچن میں تناول فرمانے لگے نعمان کو کار خریدنے کی فکر کھائے جارہی تھی وہ کئی دنوں سے سڑک سے گزرنے والی کاروں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کو اپنے بچوں کے ساتھ بے انتہا شفقت تھی وہ انھیں ہر حالت میں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے ایک بڑی کار دیکھ کر طے کیا کہ ایسی ہی کار خریدی جائے۔ اس ضمن میں اُس نے بیگم کو بلا کر کہا۔

''بیگم میں نے ایک عمدہ سی کار کا انتخاب کیا ہے قیمت دس بارہ لاکھ ہوگی۔''

یہ سنکر بیگم صاحبہ کے پاؤں تلے سے زمین جیسے کھسکنے لگی اُس کے ہوش، حواس لٹو کی طرح گھومنے لگے۔ نعمان نے بات جاری رکھتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا۔

"کیوں بیگم۔ ہوش اُڑ گئے کیا"

اُس نے جواب میں کہا۔

"آجکل تم بہت بے پر کی اُڑانے لگے ہو۔ تم نے سنا ہوگا۔ خالی برتن زیادہ بجتے ہیں اور ہاں۔ ہوش تو آپ کے اُڑ گئے ہیں اتنی بڑی رقم لاؤ گے کہاں سے۔"

نعمان نے کہا۔

"بیگم بچوں کی خوشی میں ہی ہماری خوشی ہے۔ باہمی صلح مشورے سے کوئی حل ڈھونڈ نکالیں گے۔ اسی لئے تو تم کو بلایا ہے۔"

وہ بھانپ گئی کہ اس کی نظریں اس کے گہنوں پر گئی ہونگی۔ اس کا بس چلے یہ تو بازوؤں کے کنگن بھی اُتروائے گا جو میں نے سوزن کاری کرتے کرتے مشکل سے اپنے لئے بنوائے ہیں۔" بیگم دل ہی دل میں سوچنے لگی ۔

"بیگم کن خیالوں میں کھو گئی ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ آپ کے سونے کے زیورات اور دو کنال بنڈ والی زمین، جو میری ملکیت ہے بیچ دیں گے۔ اور اگر پھر بھی روپے کم پڑ گئے"۔

"تو مکان کو بیچ دینا۔ پھر گھر گرہستی کار میں ہی کھڑی کر دیں گے۔" بیگم غصے میں آکر اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہہ اُٹھی۔

"میں اپنے گہنوں کو چھونے نہیں دوں گی اور نہ ہی زمین بیچنے دوں گی۔ کار خریدنے کا اتنا ہی شوق ہے تو وُہ ہی کرو جو سب کرتے ہیں۔ آخر اُس نے بیگم کے مشورے کو بجا سمجھتے ہوئے سوچا۔

"اس طرح کام بھی ہو جائے گا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی"۔

بیگم اُس کے سامنے میں ہی بیٹھی تھی۔نعمان نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بیگم سے کہا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ مین گیٹ کے سامنے ہی کار کے لئے گیراج بنادیں اور دن بھر پٹ کھلا رکھیں تاکہ آس پڑوس والے بھی دل کی تسلی کرلیں''

یہ سنکر بیگم جانے کے لئے اُٹھی تو اُس نے پھر آواز دی۔

''بیگم میں کار سیل سینٹر جار ہا ہوں''۔

اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اُس جانب چل پڑا۔کار سیل سینٹر ایک کلومیٹر کی دوری پر واقع تھا وہ ہشاش بشاش مستی کے عالم میں سڑک پر چلا جار ہا تھا کہ اُس کا پاؤں ایک گڑھے میں پھنس گیا لیکن گرنے سے خود کو بچالیا۔سڑکوں کی خستہ حالت پر وہ سوچنے لگا۔

''وہی پرانی گھسی پٹی سڑکیں۔نہ جانے کن وقتوں سے اپنی چھاتی پھیلائے گاڑیوں کا بوجھ سہتی آرہی ہیں کسی کی توجہ بھی اس جانب نہیں جاتی سبھی اپنی دھن میں مگن۔کیا راجا کیا پرجا۔اس بے چاری سڑک کا درد کون سمجھے۔اس کی چھاتی پر لگے یہ بڑے بڑے گھاؤ کون بھر دے گا خیر یہاں تو سب کی چھاتیاں چھلنی ہوئی ہیں اور وہ طبیب بھی کہاں رہے جو درد کا مداوا کرتے تھے۔''

پھر آگے بڑھتے ہوئے سڑک پر زور سے پاؤں مار کر سڑک کی سنگلاخی کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

''اب تو اس بے چاری کو میری کار کا بوجھ بھی سہنا پڑے گا۔''

اتنے میں ایک کالی بلی اُس کے آگے سے گزر گئی۔وہ اس کو بدشگونی سے تعبیر کرنے لگا۔اس کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔اب وہ ٹوٹے قدموں کار سیل سینٹر کے اندر داخل ہوا اور ڈیلنگ کلرک کے ساتھ بات چیت کرنے لگا۔ٹھیک اسی سمے اس کے

بھائی صاحب بھی ہنستے کھلکھلاتے داخل ہوئے۔ جو پیشے سے اکاؤٹنینٹ تھے نعمان بھائی صاحب کو دیکھ کر جیسے بھونچکا ہو گیا۔

''بھائی صاحب کیسے جان گئے کہ میں کار خرید رہا ہوں۔ کہیں بھائی صاحب بھی ۔۔۔۔۔۔؟ میں تو انھیں سر پرائز دینا چاہتا تھا۔ اگر بھائی صاحب کا منشا بھی کار خریدنے کا ہو۔ تو دو دو کاریں اکٹھے خریدنا کیا ٹھیک رہے گا۔ کہیں نظر بد نہ لگے''۔ نعمان سوچ رہا تھا کہ '' دو دو کاریں خریدنے سے کہیں کوئی انہونی نہ ہو جائے۔ مگر بھائی صاحب تو چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے بھی مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کریں ایسا تو ممکن نہیں ہے۔ انھیں ضرور کوئی اور کام ہوگا۔ میں کل آؤں گا۔''

اور وہ چھپتے چھپاتے تیز تیز ڈگ بھرتے نکل رہا تھا کہ کانچ کی دیوار سے ٹکرا گیا جو ریزہ ریزہ ہو کر سڑک پر کسی سیال چیز کی طرح گر کر بکھر گئی۔ اور وہ بچتے بچاتے گھر پہنچ گیا۔ بچوں کی نظریں اُس پر پڑیں تو وہ اُچھلتے کودتے اُس کی طرف دوڑ پڑے اور بولے۔

''پاپا آخر آپ نے کانچ کی دیوار پار کر ہی دی۔'' وہ بڑی مشکل سے کہہ پایا۔

''بچو۔۔ میں وہ کانچ کی دیوار ٹکڑے ٹکڑے کر کے آیا ہوں''۔

اور اُس کی خاموش ملتجی نظروں سے صاف اُس کی بے بسی بیان ہو رہی تھی۔ اتنے میں ایک چمچماتی کار بھائی صاحب کے آنگن میں سرُوں میں ہارن بجاتے ہوئے داخل ہوئی۔ اُس سے لگا کہ بھائی صاحب کے سرپرائز میں جیسے اُس کے بچوں کے خواب کانچ کی دیوار کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئے۔



رستے زخم

بس سٹاپ پر اچانک اس کو دیکھ کر میں حیران ہوگیا۔ آنکھیں جھپک جھپک کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دُھندلاہٹ دور ہوگئی تو میں سوچنے لگا

''کیا یہ نجمہ ہے۔"

میرے دماغ میں کھلبلی مچ گئی۔ میں بڑبڑانے لگا۔

''نہیں۔۔۔نہیں۔ یہ نجمہ نہیں ہوسکتی"

ایک خوب صورت عورت اپنے کاکل لٹکائے کھڑی تھی جیسے کسی شاعر کی محبوبہ ہو۔ باریک مہین لباس میں ملبوس یہ سر بازار شرم حیا بھُلائے اضطراری حالت میں نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ میں نے شک دُور کرنے کی خاطر اس فاصلے کو طے کرنا چاہا۔ اردگرد نظریں دوڑائیں۔ بازار میں جمع لوگ اور دُکاندار ٹکٹکی باندھے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہے تھے۔ مجھے یہ فاصلہ ماونٹ ایورسٹ سر کرنے کے برابر نظر آنے لگا۔ یہ عورت نجمہ سے بہت مشابہت رکھتی تھی۔ سورج کی شعاعیں صدیوں پرانے چنار کے گھنے سایے کو چیرتی ہوئی اس کے چہرے پر قوس قزح کی طرح رنگ بکھیر رہی تھیں۔

''چنار کے سایے میں کھڑی کہیں یہ نجمہ ہی تو نہیں"۔ میں نے سوچا۔

میں بُت کی طرح بے حرکت ایک جگہ جیسے نصب ہوگیا تھا۔ کہ اچانک ایک لنگڑا اندھا آدمی برلب سڑک آدھمکا۔

''کوئی سڑک پار کروائے اندھے کو" وہ آواز دے رہا تھا۔

مجھے جلد ہی ایک شیطانی چال سوجھی۔ میں نے بڑی عیاری سے اندھے کو بیچ سڑک کی طرف چلتا کیا۔ گاڑیاں ٹکرا گئیں اور شیشے چکنا چور ہو کر سڑک پر کسی سیال شئے کی طرح بکھر گئے۔ اور لوگ گرتے سنبھلتے نظر آنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُدھم مچ اُٹھا۔ سب اندھے کی طرف دوڑ پڑے۔ تو میں اُس عورت کی طرف بلا خوف و خطر چل پڑا۔ میری اس حرکت پر میرے ضمیر نے میری سرزنش تو کی لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا تو میرے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ یہ نجمہ ہی تھی۔ میں حواس باختہ ہو گیا۔ تصویر جو صاف ہو گئی تھی۔

عرصہ بیت گیا جب میں نے اس کو کالج کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس کی چپل کی ایڑی نکل آئی تھی۔ وہ مڑ کر جھکی ایڑی سنبھالنے لگی اور نیم جھکی حالت میں ہم دونوں کی نظریں ٹکرا گئیں۔ اُس کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل پڑے۔

"او۔ شٹ"

گول گول چہرے پر غصے سے جھریاں گرہیں باندھتی نظر آنے لگی تھیں جیسے دریا کی مچلتی لہریں پانی کی سطح پر اُبھر کر خوف، ہراس بپا کر کے دل دہلا دیتی ہوں۔ میں گھبرا گیا۔ لیکن اُس کی آنکھوں سے عاجزی جھلک رہی تھی۔ شاید مدد چاہتی تھی۔

"مجھے اس مشکل گھڑی میں اس کی مدد کیلئے آگے بڑھنا چاہئے" دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

کالج اسی روز کھل گیا تھا۔ نئے سال کے داخلہ فارم کے لئے متعدد جگہوں پر کونٹر کھولے گئے تھے۔ طالب علم داخلہ فارم لے رہے تھے۔ گپ شپ، ہنسی مذاق میں مگن نظر آ رہے تھے۔ وقت کی پابندی کا کوئی خیال تھا ہی نہیں۔ مست، چہرے کھلے ہوئے۔ فکر و الم کا نام و نشان نہیں۔ نئے تعلیمی سال کی آمد پر ڈینگیں مارتے نظر آ رہے تھے۔ تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

میں گاؤں سے تھا۔ سیدھا سادہ شرمیلہ۔ میں اُس کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے اندر سے آواز آئی۔

''خبردار۔ یہ کیا کر رہے ہو۔ کسی نے دیکھ لیا تو"۔

میں نے اس آواز کی ان سنی کردی۔ میں ارد گرد دیکھنے لگا تو طالب علم برآمدے میں ٹولیوں میں مصروف گفتگو تھے۔ جدیدیت کا لبادہ اوڑھے وضع قطع انگریزوں جیسی بنا کر اپنے خیالوں میں گُم تھے۔ جیسے آزاد فضاؤں میں آزاد پنچھی۔ میں اپنے گاؤں کی سادگی۔ شرم حیا ان من چلے لڑکے لڑکیوں میں تلاش کرنے لگا۔ جس کا جدیدیت کے زیر سایہ یہ کفن دفن کر چکے تھے۔ بڑوں کا ڈر نہ کہیں چھوٹوں کا لحاظ۔ کہیں ہاتھ ہوا میں ٹکرا کے تو کہیں ہاتھوں پر بوسہ دیکر ہائے ہلو کہتے نظر آ رہے تھے۔ ان کی یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں دیکھ کر میں سوچنے لگا۔

''شاید ماضی بعید کی کسی بیتی ہوئی صدی کے کسی بھلے مانس کی روح میرے اندر بس رہی ہے۔''

مجھے اس ماحول میں ہم آہنگ ہونا دشوار لگ رہا تھا۔ دن بھر کچھ لڑکے نئے طلاب کو ریگنگ کرتے ہوئے نئے نئے تماشے کرتے رہتے۔ یہانتک کہ ہاتھا پائی بھی ہو جاتی تھی۔ ایک لمحے پہ ایک نو وارد کو استادہ ہونے کے لئے کہا۔ پھر سب کے سب اس کے ارد گرد کھڑے ہو کر اس کا تمسخر اور مذاق اُڑانے لگے۔ یہ دیکھ کر میں وہاں سے کھِسک گیا۔

میں نجمہ کی مدد کے لئے آگے بڑھنے لگا۔ سیڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا۔ کہ میں نے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنی۔ پرنسپل صاحب بڑی پھرتی سے نیچے آ رہے تھے۔ دراصل کالج کی دوسری منزل سے پرنسپل صاحب کو طلاب کے جمگھٹے پر نظر پڑی تھی۔ جہاں یہ نو وارد طالب علم مداری کے بندر کی طرح اُچھل کُود کر رہا تھا۔ پرنسپل

صاحب غصّے میں لگ رہے تھے۔ایک لڑکے نے آواز دی۔

''بھاگ جاؤ۔''

سب تتر بتر ہوگئے۔اس بھاگم بھاگ میں کچھ لڑکے گر بھی پڑے۔میں سیڑھیاں چڑھ کر نجمہ کے پاس پہنچ گیا میرے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔پیشانی پر پسینہ چھُوٹنے لگا۔میں نے کہا۔

''چپل دیجیۓ میں ٹھیک کر کے لاتا ہوں"

نجمہ ماڈرن فلمی ماڈل لگ رہی تھی۔ہونٹوں پر لپسٹک کا پلاستر افق پر شفق کے مترادف، اس کے گول گول چہرے کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔اور سر کا کلّ ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے لہرا کر ایک کالے ناگ کی طرح جیسے اس کے حُسن کی حفاظت کے لئے مقرر ہو۔

اس نے خاموشی سے چپل تھمادی۔میرے اندر سراسیمگی پیدا ہوئی۔اور طرح طرح کے خیال آنے لگے۔میں بڑبڑانے لگا۔

''کہیں یہ بہری تو نہیں؟ کہیں یہ گونگی تو نہیں۔"

پھر چپل لے کر میں چل پڑا

مین گیٹ کے بالکل نزدیک ایک موچی کی دکان تھی اُس نے بغیر تاخیر چپل ٹھیک کردی۔میں تیز تیز ڈگ بھرتے ہوئے نجمہ کے پاس پہنچ گیا۔وہ مخاطب ہو کر بولی۔

''شکریہ"

پھر وہ چلی گئی۔

کالج میں درس وتدریس کا کام شروع ہوتے ہی طلاب بڑے ذوق وشوق سے پڑھائی میں مصروف ہوئے۔میں روز نجمہ سے ملتا رہا۔

نجمہ بہت خوبصورت تھی۔ میں اس کی طرف مائل ہو رہا تھا۔

کالج لائبریری بڑے دل کش انداز میں آراستہ و پیراستہ کی گئی تھی۔ یہ کاریگروں کی ضاعی اور ہنر مندی کی بے مثال فن تعمیر کی نظیر لگ تھی۔ متنوع ادبی، سماجی۔ سیاسی، معلوماتی کتابیں طاق بہ طاق سبھی طلباء کے لئے کشش کی باعث بنتی۔ اس وادی گلپوش کے بڑے بڑے سیاحتی مناظر کی تصویریں ایک بڑے ہال کی دیوار پر آویزاں راحت وفرحت بخشنے کا کام کرتی تھیں۔ ہر ایک چیز قرینے سے ہال میں رکھی گئی تھی۔

میں لائبریری میں بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔

''او۔۔۔شٹ" کہیں سے آواز آئی ۔

میں ادھر ادھر تاک جھانک کرنے لگا۔ لڑکیاں اندر لائبریری میں آرہی تھیں میں پھر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اتنے میں نجمہ میرے قریب آ کر بولی

"حضور کیا میں بیٹھ سکتی ہوں"

ہم سب کو لائبریری انچارج کا ڈر رہتا تھا۔ کیونکہ وہ نظم و نسق کی خلاف ورزی کرنے والے کی پرنسپل سے شکایت کرتے تھے۔ جس پر ڈانٹ ڈپٹ پڑتی۔ آج اُن کی کرسی خالی تھی۔ ہال طلاب سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔

''ارے حضور ادھر دیکھئے۔ ہم تو کب سے کھڑے ہیں"

مجھ میں اضطراری کیفیت پیدا ہو گئی۔ پسینہ چھوٹنے لگا۔ زبان لڑکھڑانے لگی۔ کہے تو کیا۔ اتنے میں نجمہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگی میں شرم کے مارے پسینے پسینے ہو کر سوچنے لگا۔

''آج کل کی لڑکیوں میں نہ کوئی لجا ہے نہ ڈر ۔

نجمہ نیم برہنہ سامنے بیٹھی تھی۔ میں نے اعتراض جتاتے کہا۔

''یہ کیسا لباس پہنا ہے آپ نے" وہ توتلے لہجے میں بولی۔

''حضور کو پسند نہیں۔ تو کل سے نہیں پہنوں گی۔'' یہ سنکر مجھے خوشی ہوئی۔

''وعدہ''

''حضور کو یقین نہیں آرہا ہے۔ تو کپڑوں کو تیلی دکھا کر جلا ڈالوں۔''

''دیکھئے مجھے مذاق پسند نہیں ہے۔''

''ارے حضور آپ کس دنیا میں رہ رہے ہیں''۔

''آپ کو یہ طرزِ زندگی مبارک ہو۔ میں چلا۔

''ارے۔۔۔ارے۔۔۔۔حضور تو ناراض ہو گئے۔ تھوڑی دیر بیٹھ جایئے''۔

''اچھا حضور کو یہ لباس پسند نہیں''۔

''آپ وعدہ کیجئے آئندہ آپ ایسا لباس نہیں پہنیں گی۔

''وعدہ''

ہم وہاں سے چل پڑے۔ چلتے چلتے نجمہ کی ساڑھی فرش پر گر پڑی۔

''او۔۔۔شِٹ'' مجھے غصہ آیا۔

''دیکھئے یہ انگریزوں کے لہجے میں بولنا بند کر دیجئے۔''

''اچھا حضور یہ بھی کریں گے''۔ اور ہماری دوستی نے مضبوطی پکڑ لی۔

اب نجمہ بہت بدل چکی تھی۔ اور یہ کالج میں پڑھائی کا آخری سال بھی تھا۔ ایک لمحے پر ہم پارک میں بیٹھے محوِ گفتگو تھے میں نے پوچھا۔

''نجمہ آگے کیا ارادہ ہے''

''خدا مہربان ہو تو یونیورسٹی میں داخلہ لیں گے''

میرے گھر کی معاشی حالت خراب تھی۔ اور ماں بیمار رہا کرتی تھی۔ میں بول پڑا۔

''مگر نجمہ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے میری پڑھائی رُک سکتی ہے''

''آزاد ایسا مت سوچو۔ میں ہوں نا۔ میں آپ کی مالی معاونت کروں گی۔"
اس نے کہا۔

اس بات نے نشتر کی طرح چبھ کر دل سے خون کے فوارے جاری کر کے میرے اندرون کو لہولہان کر دیا۔ میری خودداری پر کاری ضرب پڑی۔ میرے چہرے پر مایوسی کے آثار نمودار ہوئے۔

نجمہ یہ بھانپ کر بولی۔" آپ کیا چاہتے ہو"۔

''نجمہ شاید ہم انجان راہوں کے مسافر ہیں اب ہمارے جدا ہونے کا وقت آ گیا ہے"

اُس نے مُنہ پہ ہاتھ رکھا۔

''خدا کے لئے شبھ شبھ بولا کرو"۔

''پھر آگے پڑھنے کی چاہ سینے میں ہی دفن کرنی ہوگی۔

''لیکن آزاد"

''لیکن ویکن کچھ نہیں"

نجمہ چپ رہی۔ اُس کی کچھ سہیلیاں ہمارے آس پاس ہی گھوم رہی تھیں ہماری قربت پر جل رہی تھیں شاید۔

ہم نے رشتہ ازدواج میں ہمیشہ کے لئے بندھ جانے کی قسمیں کھائیں۔ مگر یہ نجمہ سے میری آخری ملاقات ثابت ہوئی۔

وہ کئی دنوں سے کالج نہیں آ رہی تھی۔ میری تشویش بڑھتی گئی۔ میرے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ شہر رشتہ داروں کے ہاں گئے ہیں۔ میں منتظر رہا یہانتک کہ کئی سال گزر گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے میں زندگی کے اُدھیڑ پن میں داخل ہو گیا۔

بس سٹاپ پر کھڑی یہ عورت نجمہ ہی تھی۔ قبل اس کے میں اُس سے پوچھ لیتا۔ وہ

گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ وہ اب بھی پہلی جیسی خوبصورت لگ رہی تھی۔

اگلے دن میں حسب معمول کام کے لیے چل پڑا۔ دن کے کسی بے نام پہر میں نجمہ دل کے آئینے پر اُبھر کر پھر مجھے ستانے لگی۔ پھر پہلی سی محبت دل میں انگڑائیاں لینے لگی۔ پھر جذبات مچلنے لگے۔ میں ضبط نہیں کر پا رہا تھا میں بے صبری سے کوچہ یار کی طرف چل پڑا۔

میں راستے کے نشیب وفراز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بالآخر اس کے گھر پہنچ ہی گیا۔ صحن سُونا سونا لگ رہا تھا۔ دیوار کا روغن متعدد جگہوں پر پھیکا پڑا ہوا تھا۔ بدزیب لگ رہا تھا۔ میں نے بیل بجادی۔

''نجمہ"

میری زبان پہ بے ساختہ اس کا نام آیا۔ وہ لڑکھڑا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اندر بیڈ پر دو بزرگ لیٹے ہوئے تھے۔ بیسا کیاں نزدیک ہی پڑی تھیں۔ یہ دونوں اپاہج تھے۔ میں سیدھا ڈرائنگ روم کے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر میں نجمہ اندر آئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھ پر جیسے بجلی گر گئی۔ میرے استفسار پر اُس نے کہا۔

''آزاد میرے والدین پر انجلی نے جب یہ راز افشاء کیا۔ تو سنتے ہی ڈیڈی ناراض ہو گئے۔ مگر میں اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔ ڈیڈی نے صاف صاف انکار کر دیا اور میری کوشش بے فائدہ ثابت ہوئی۔ آخر اپنے رشتے میں میری شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ رشتے دار شہر میں آباد تھے۔

اُس روز ہم سویرے گھر سے چل پڑے۔ شہر کے پر ہجوم بازار میں ایک بھیانک حادثہ ہوا جس میں میرے والدین اپاہج ہو گئے۔ رشتہ داروں کے ہاں پڑے رہے۔ پچھلے مہینے ہی گھر لوٹ آئے۔''

یہ سنکر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ نجمہ سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا۔

''شادی" وہ بھرائی آواز میں بولی۔

''ابھی تک تو نہیں ہوئی۔''

پھر یہی سوال اس نے مجھ سے بھی پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وقت بہت ہو چکا تھا۔ اور اندھیرا بھی ہونے لگا تھا ۔ میں نجمہ کے والدین کے اپاہج پن کا ذمہ دار خود کو ہی ٹھہرانے لگا۔ یہ سوچ کر میرے بدن میں جیسے سوئیاں چبھنے لگیں۔ میں وہاں سے چل پڑا۔ نجمہ زور زور سے چلانے لگی۔

''اس کو روک دو............ڈیڈی۔''

اس کے ڈیڈی چپ رہے۔ نجمہ برابر اندر روئے جا رہی تھی۔ میں صحن میں دریچہ وا ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر اندر سے صرف چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں جاتے جاتے یہ چیخیں بہت دیر تک میرا پیچھا کرتی رہیں۔ اور۔۔۔ زخم رستے گئے۔



بھیڑیئے

مالک نے اُس کے دل میں جذبہ ہمدردی کوٹ کوٹ کے بھر دیا تھا۔ اُس کا دل ان نادار بچوں کے لئے پسیجتا تھا جو وقت کی بے رحم سازشوں میں اپنے سرپرست کھو چکے تھے۔ اور زندگی کے سفر میں ایک مربی کے خواستگار تھے۔ ان کی حالت زار دیکھکر وہ ایک سلگتے تنور کی طرح جوش کھا رہی تھی اور ایک مسیحا کی طرح بے خطر آگے بڑھی۔ اُسنے ایک ٹیوشن سینٹر کھول دیا۔ اور ان ننھے فرشتوں کی مفت تعلیم و تربیت کرنے لگی۔ نزہت روز بعد دوپہر ٹیوشن سینٹر جاتی۔ لیکن جانے سے پہلے وہ نصاب کو ایک آنکھ دیکھ لیتی اور مشکل عبارتوں کو اچھی طرح سمجھ لیتی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ننھے بچے اُستاد کی ایک ایک حرکت کی نقل کرتے ہیں اور اُستاد کے منہ سے نکلا لفظ صحیح مان لیتے ہیں۔ اسی خدشے کے مدِنظر وہ تدریسی غلطی کا خاص خیال رکھتی تھی۔ جس کا نسل در نسل منتقل ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

نزہت نیک سیرت تھی۔ ان ننھے بچوں میں اُس کی جان اٹکی تھی۔ کتابوں کا بستہ اُٹھائے، وہ ٹیوشن سینٹر کے لئے نکلی تو حلیمہ بی نے آکر کہا۔

''بیٹی۔ تم نے یہ شعر سنا ہوگا۔ جان ہے تو جہان ہے۔ صحت ہے تو شان ہے میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اپنی صحت سے بے فکری برتتی ہو"

اس نے چائے کی پیالی اور دو انڈے اُسکے ہاتھوں میں تھما دیئے۔

''آرام سے پی لو۔" تھوڑی سی خاموشی کے بعد بولی۔

''بیٹی۔ ذرا ہوشیار رہنا کئی دنوں سے یہ باتیں چل رہی ہیں کہ شہر میں جنگلی بھیڑیئے پھر رہے ہیں۔ جو اچانک انسانوں پر حملہ کر دیتے ہیں۔''

''اوہو امی۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ میں ان باتوں میں یقین نہیں کرتی۔''

حلیمہ بی پل بھر کے لئے بیٹی کو تکتی رہی۔ پھر بولی ۔

"بیٹی۔ میری آنکھ پھڑک رہی ہے۔ ذرا اپنا بازو لاؤ۔"

اور اس نے سیاہ دھاگے میں بندھا ایک تعویذ اُسکے بازو پر باندھ دیا۔ نزہت جلد ہی امی کی پریشانی بھانپ گئی۔ اور اسے بغل گیر ہو کر دلاسہ دیتی رہی۔

''امّی ۔ لوگ افواہیں پھیلاتے ہیں۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''بیٹی ۔ ماں ہوں نا۔ ڈر رہتا ہے"

نزہت تعجب سے دیکھکر بولی۔

''امی۔ جہاں اتنے لوگ چلتے پھرتے ہوں۔ وہاں کیسا ڈر!۔

''بیٹی۔ انسان اسقدر خودغرض بن گیا ہے کہ ذاتی مفاد کے لئے بے دردی سے بن کے بن کاٹ رہا ہے۔ جہاں ان جانوروں کی پناہ گاہیں ہیں۔ یہ اپنی دنیا میں آباد تھے۔ چپ چاپ گھوم پھر رہے تھے۔ انسان ان کے گھر ڈھا رہا ہے۔ تو یہ ضرور وار کریں گے"

''امی آپ کی یہ بات تو بالکل صحیح ہے۔"

''بیٹی۔ انھیں بھی جینے کا حق ہے۔ یہ جانور ماحول میں توازن برقرار رکھنے کے لئے بڑے اہم ہیں۔ انسان جب بھی فطرت کے اصولوں کے خلاف کوئی عمل کرتا ہے۔ تو اُسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ انسان تو جانتا ہے کہ درختوں پر ہمارے بود و باش کا انحصار ہے۔ لیکن اب یہ بے درد بن گیا ہے اس میں تخریبی سوچ پنپنے لگی

ہے۔''

بات چیت نے طول پکڑ لیا تو نزہت یہ کہہ کر چلی گئی ۔

''میں اپنا خیال رکھوں گی۔"

نزہت بچوں پر جان چھڑکتی تھی اور ان کی تعلیم وتربیت اُسنے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ اور ان معصوم بچوں کے روشن مستقبل کے لئے بہت محنت کر رہی تھی جو پسماندہ گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔

نزہت کو اُس گلی سے روز ہی گزرنا پڑتا جس کے اطراف میں اونچی اونچی عمارتیں سورج کی شعاؤں کی راہ میں رکاوٹ بنی کھڑی تھیں۔ اور جن سے گلی میں اندھیرا رہتا تھا۔ لوگ اس کو تاریک گلی کے نام سے پکارتے۔

تاریک گلی کے بالکل نزدیک بچے روز نزہت کا انتظار کرتے۔ پھر اکھٹے ٹیوشن سینٹر چلے جاتے۔ اس تاریک گلی میں ڈراونی آوازیں سُنائی دیتیں اور گاہے گاہے کتوں کی ہڑبونگ سے ڈر کر بچے اپنی ٹیچر سے چمٹ جاتے۔ اور وہ ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر انھیں حوصلہ دیتی رہتی۔ اور ان کے ڈر کو دور کرنے کی کوشش کرتی۔

حسب معمول وہ ایک روز تاریک گلی سے گزر رہی تھی کہ کچھ اوباش دیوار کی آڑ میں رہ کر اس کو پریشان کرنے لگتے۔ تو اس نے بچوں کو لوری پڑھنے کا اشارہ کیا۔ اور اس عمل میں خود بھی شامل ہوئی۔ آخر ڈرے سہمے سب ٹیوشن سینٹر پہنچ گئے۔ اور کچھ پل سُستانے کے بعد تدریسی عمل میں مصروف ہوئے۔

اس تاریک گلی کو لوگ آنکھ جھپک میں پار کرنے کی تاک میں رہتے۔ نزہت تدریسی عمل سے فارغ ہو کر پریشان گھر لوٹی۔ اور اضطراری حالت میں گھر پہنچ کر کمرے میں گھومنے لگی۔ اسکے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور دماغ میں خدشات

ابھر رہے تھے وہ سوچ میں ڈوبی تھی۔ کہ حلیمہ بی آ کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بیٹی کی دگرگوں حالت بھانپ کر اس سے پوچھا۔

''بیٹی۔تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔کیا ماجرا ہے؟

نزہت نے جب کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا تو حلیمہ بی کچن میں چلی گئی اور اسپند لا کر جلا دیا۔

"بیٹی۔تمام بلائیں دُور دفع ہو جائیں گی۔تم دیکھنا۔" نزہت قدرے اطمنان سے بولی۔

''امی۔تم خواہ مخواہ گھبراتی ہو۔ مجھے کیا ہوا ہے۔ میں تو صحیح سالم ہوں۔تم بھی نا ------''

حلیمہ بی نزہت کو اپنے ہمراہ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ اور صوفہ پر بیٹھ کر دونوں محو گفتگو ہوئیں۔اور باتوں باتوں میں حلیمہ بی نے بیاہ کی بات چھیڑ دی۔

''بیٹی۔ ہر ماں باپ کی چاہ ہوتی ہے کہ انکی اولاد گھر گرہستی سنبھال لے۔تم اب جوان ہوگئی ہو۔اور ہم نے تمہارا بیاہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

امّی" کہہ کر اس نے شرم سے سر جھکا دیا اور حلیمہ بی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"بیٹی۔ اچھا گھرانہ ہے۔ چار پیسے ہاتھ میں ہیں۔لڑکا بھی شریف ہے۔اور ہاں۔۔۔وہ تمہیں ٹیوشن سینٹر پر دیکھ کر پسند بھی کر چکے ہیں۔بیٹی پرسوں لڑکے والے انگوٹھی پہنانے گھر آرہے ہیں۔

نزہت خاموش رہی۔اور کچھ دیر کے بعد اس نے امی کو پیش آیا واقعہ سنا دیا۔

''امّی۔میں تاریک گلی سے گزر رہی تھی کہ کچھ بدمعاش دیوار کی آڑ لیے خرافات بک رہے تھے۔میں ڈر گئی تھی۔''

حلیمہ بی غصے سے لال پیلی ہو کر بولی۔

" اُنکے مُنہ میں خاک۔ یہ لڑکے سر پھرے بنتے جا رہے ہیں اور ہماری تہذیب کی پرخچیں اُڑانے پر تلے ہیں۔ لیکن کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی ہے"۔

"امی۔ میں سوچ رہی ہوں کہ بچوں کو گھر ہی بُلا لوں۔"

"بیٹی۔ اچھی بات ہے۔ گھر بُلا لو انکو۔"

نزہت دیر رات تک پریشانیوں میں اُلجھی رہی۔

اگلے دن گھر کے لوگ جوش وخروش سے کار خیر کی تیاری میں جُٹ گئے کچھ گھر کی صفائی ستھرائی کراتے رہے تو کچھ پُرانا فرش بدلنے لگے گھر میں رونق آ گئی۔

لیکن نزہت کے چہرے پر پژمردگی بدستور چھائی ہوئی تھی۔ اُس کے دل ودماغ میں طرح بہ طرح کے خدشات موجوں کی طرح اُمڈ آرہے تھے۔ لیکن۔۔۔۔۔ پھر وہ جلد ہی اٹکلیوں کے بھنور سے نکل کر اس واقعہ کو بُرا سپنہ سمجھ کر بھول گئی۔

وہ حلیمہ بی کا ہاتھ بٹانے کچن میں چلی گئی۔ اس کے ہاتھوں سے بیلن چھین کر بولی۔

"امّی۔ میں روٹیاں بناؤں گی۔ تم ذرا آرام کر لو۔"

"لیکن بیٹی۔ تم نے کب روٹیاں بنائی ہیں۔"

"امّی۔ میں سیکھ لوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ گھر گرہستی جتنی جلدی سیکھ جاؤ گی۔ بہتر ہے۔ اب اس گھر سے وداع جو ہونا ہے۔"

"امّی میں تم کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی"۔

"بیٹی۔ ہر بیٹی کو ایک دن سسرال جانا ہی پڑتا ہے۔ یہ دنیا کا دستور ہے۔"

دوپہر کا کھانا کھاتے ہی عزیز و اقارب کی بھیڑ گھر میں اُمڈ آئی۔ اور سب حلیمہ بی کو بڑے پیار سے تحائف پیش کرتے رہے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ سب کی خوشی کے مارے باچھیں کھلنے لگیں۔ مہمانوں کی خاطر مدارات کی پوری تیاری کی گئی تھی۔ اور سب آنکھیں بچھائے مہمانوں کا انتظار کر رہے تھے۔

نزہت تدریسی کام سے فارغ ہو کر گھر لوٹ ہی رہی تھی کہ تاریک گلی کے نزدیک پہنچتے ہی آوازیں فضا میں گونج اُٹھیں۔

''بھاگو۔۔۔۔۔ بھاگو۔ شہر میں بھیڑیے گھس آئے ہیں۔''

لوگ مارے ڈر کے تتر بتر ہو گئے۔ اور دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ہر طرف خوف، ہراس پھیل گیا۔ راہ گیر آنکھ جھپکنے میں غائب ہو گئے۔ اور یہ ننھے بچے جو ٹیچر کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ ادھر اُدھر بکھر کر چُھپ گئے۔ گلی سنسان پڑ گئی۔

نزہت حواس باختہ تاریک گلی کے اندر چلی گئی۔ کہ اچانک چند سر پھرے اس سے دست درازی کرنے لگے۔ وہ اس حماقت پر اعتراض جتاتی رہی۔ مگر صنف نازک۔ کیسے اکیلے ان غنڈوں کے چنگل سے چُھوٹ جاتی۔ اُس نے زور سے چیخنا چلانا شروع کیا۔ تو بچے ٹیچر کی آواز سنکر ایسے دوڑ پڑے جیسے زور کا سیلاب آیا ہو۔ اور غنڈے بھاگ گئے نزہت نیم برہنہ حالت میں زخمی پڑی تھی۔ جسم پر چوٹیں لگی تھیں۔ کچھ لوگ جمع ہو گئے اور خون میں لت پت نزہت کو اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر نے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ نزہت کچھ سنبھل سی گئی تو بچے اس کی بغل میں جا کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر کے استفسار پر نزہت نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب۔ خدا کا شکر ہے یہ ننھے فرشتے بروقت مسیحا بن کر آئے اور وہ بھیڑیئے بھاگ گئے''۔

بچے یک زبان ہوکر بولے۔

''دیدی وہ بھیڑے نہیں تھے۔"

بچو! وہ انسانی رُوپ میں بھیڑیے ہی تھے۔

اسپتال میں موجود لوگ سماجی اقدار کے تنزل پر ہونٹ چبا رہے تھے اور حلیمہ بی سینہ کوبی کرتے وارڈ میں داخل ہوگئی۔



انتظار

جانکی دیوی، وہی میر صاحب کے پڑوس میں رہنے والی اُدھیڑ عمر کی عورت۔ جسے محلے کے بچے پیار سے کا کی جی بُلاتے تھے۔اتنی حلیم اور اتنی محبتی۔ کہ اپنا سارا پیار بچوں پر لُٹاتی رہتی۔غزآلہ اُس کی دُلاری۔اُس کی نظروں نظروں میں جوان ہو گئی۔اُس صبح وہ ناشتہ کر کے ڈرائنگ روم میں بے چین سی گھوم رہی تھی۔اور پریشان لگ رہی تھی۔اسی حالت میں وہ اپنے شوہر پیارے لال سے مخاطب ہو کر بولی۔

''تمہارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی ہے۔غزالہ میر صاحب کی ہی نہیں۔ ہماری بھی بیٹی ہے۔اُس کا بیاہ ہے۔اور تم آفس کے کام میں الجھے ہوئے ہو۔اب مہینہ بھر کی چھٹی لے لو"۔

پیارے لال اُس کو ٹکر ٹکر دیکھتے ہوئے بولے۔

''ارے بھاگوان۔کل کی ہی بات ہے۔غزآلہ کی شادی کی تاریخ ٹھہرا کر آئے ہیں"۔

''ہاں ہاں۔وہ میں بھی جانتی ہوں۔مگر شادی کی تیاری کرنی ہے۔بہت سارے کام ہیں اُنسے تو منھ پھیر نہیں سکتے"۔

''میں نے کب ایسی بے تکی بات کہی ہے۔بیاہ کا دن نزدیک آنے تو دو"۔

''مگر وہ ہمارے تعلق سے کیا سوچ رہے ہونگے۔کہ سر پر لحاف اُوڑھے بیٹھے ہیں"۔

کا کی جؔی ایک نیک عورت تھی۔ میر صاحب کے خانوادے سے ابتداء سے جڑی ہوئی تھی۔ اُسی سمے سے جب وہ اس بستی میں بیاہی گئی تھی۔ مرؔیم جان میر صاحب کی اہلیہ اُس کے بچپن کی دوست بھی تھی اور دونوں بہنوں کی طرح رہتی تھیں۔ کا کی جؔی کی رُوح ان بچوں میں بسی تھی۔ غزاؔلہ کے جسم پر ذراسی خراش آجاتی تو وہ تلملا اُٹھتی۔ وہیں مریم جان بھوشؔن کی ایک ہفتے کی دُوری برداشت نہیں کرتی۔ کہتی۔

''اُس کو دیکھے بنا میرا کلیجا پھٹنے کو آتا ہے۔''

جبھی ایک بار اُس کو دیکھنے یونیورسٹی بھی گئی۔ اتنے مخلص، ہمدرد اور محبتی لوگ دنیا میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ یہ اکثر تہواروں پر بچوں کے لئے تحائف لینے بازار اکھٹے جاتیں۔ جب عید ہوتی تو بچؔے مریم جان کے پاس میں بیٹھ کر عیدی مانگتے۔ وہ بڑی فیاضی سے دیدیتی۔ وہیں کا کی جؔی شیوراترا کے دن ڈھیر سارے تحفے بچوں میں بانٹتی۔ انھیں بہت سارے اخروٹ دیدیتی۔ اور اپنی دوست کے گھر مچھلیوں کا روایتی سالن بھیج دیتی تھی۔ وہ اُتاولی کیوں نہ ہوتی۔ غزالہ کی شادی جو تھی۔ اُس غزاؔلہ کی جسے وہ موت کے منھ سے بچا کر لائی تھی۔ تب وہ چھوٹی معصوم سی بچی تھی اور کھیلتے کھیلتے کنویں میں گر گئی۔ مرد کام پر گئے ہوئے تھے۔ کا کی جی بے خوف کنویں میں کود کر اُس کو سلامت باہر لے آئی۔ مانو غزالہ کو دوسرا جنم مل گیا ہو۔۔ تب سے غزاؔلہ اُسے چمٹی رہتی۔ کچھ دیر بعد کا کی جی پھر بولی۔

''تم چلو گے بھی۔ اب بیاہ میں تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ آنکھ جھپکتے ہی نکل جائیں گے۔ وہ سسرال چلی جائے گی۔ ساس سسر بزرگ ہیں۔ انکی دیکھ بھال اور خدمت گزاری میں لگے گی۔ پھر مشکل سے ہی بیٹی کے درشن ہونگے''۔

وہ مخاطب ہو کر بولا۔

''تم فکر مت کرو۔ کچھ دن صبر کرو۔ پھر اکھٹے جائیں گے''

کا کی جی ہونٹوں پر تبسم پھیلائے بولی۔

"میں اس رشتے سے بہت خوش ہوں۔اچھے لوگ ہیں۔غزالہ کو بیٹی کی طرح رکھیں گے۔مطلق اجنبیت کا احساس ہونے نہیں دیں گے۔میکے کا راستہ سچ میں بھول جائے گی۔ان لوگوں کی بھی خوش بختی ہے جوایسی گُنی بہو ملی۔اُس گھر کوسورگ بنادے گی"۔

پھر وہ قدرے شرارت بھرے لہجے میں بولی۔

"بیاہ والے دن جاؤ گے کیا۔تم کیا نہیں جانتے۔جوتی کی شادی پر وہ ایک ماہ قبل گھر کو تالا چڑھا کر آئے تھے۔اور کیسے شادی کی تیاریاں کی تھیں۔اسی بھائی چارے پر ہمارے سماج کی عمارت ٹکی ہے۔اس کو لڑکھڑانے مت دو۔ہم اس چمن کے باسی ہیں۔جو ساری دنیا میں جُدا گانہ ہے۔ہم اوروں سے الگ ہیں۔بھائی چارے اور انسانیت میں۔"

پیارے لال کے سامنے فائلیں بکھری پڑی تھیں۔کا کی جی نے انھیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"غزالہ کو دیکھنے کے لئے میرا کلیجا پھٹ رہا ہے۔میں انتظار نہیں کرسکتی۔تم یہ آفس کے کام آفس میں ہی نپٹایا کرو۔میں چلتی ہوں۔تم دروازے پر تالا چڑھا کر بھوشن اور جوتی کو لیکر جلدی آنا"۔

اُس نے آنکھ جھپکتے ہی گھروں کے درمیان کی مسافت طے کی۔اُس کے آنگن میں وارد ہوتے ہی مریم جان نے آواز دی۔

"رُک رُک کا کی جی۔پہلے آرتی تو اُتاروں۔جلدی آنکھ کھُل گئی ہے۔ہم سے کوئی قصور ہوا ہے کیا؟۔جو اُکھڑے اُکھڑے رہتے ہو۔پیارے بھائی صاحب کہاں ہیں"۔

کا کی جی اندر ہی اندر شرمندہ ہوئی۔وہ سیدھے اوپر ہال میں چلی گئی۔

''کہاں ہے میری بیٹی غزالہ۔واری جاؤں۔''

''آداب کاکی جی۔''

''ماشاءاللہ۔میری بیٹی نکھر نکھر سی گئی ہے۔اللہ نظر بد سے بچائے۔اب میری بیٹی سسرال جائے گئی۔''

غزالہ نے زور سے اُسکو گلے سے لگالیا اور روتے روتے بولی۔

''کاکی جی۔میں بیاہ نہیں کروں گی۔تم کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

کاکی جی نے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''بیٹی تم اب بڑی ہوگئی ہو۔تمہیں اپنی گھر گھرہستی سنبھالنی ہے۔یہ دنیا کا دستور ہے۔"

پھر مریم جان سے مخاطب ہو کر بولی۔

"سنتی ہو مریم۔ان کے بھاگ اچھے ہیں۔جو ایسی بہو ملی"۔

مریم نے مزید استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔

''پیارے بھائی صاحب کہاں ہیں"۔

''سب آئیں گے۔تم فکر مت کرو۔ہماری بیٹی کی شادی ہے۔بڑی دھوم دھام سے غزالہ کو رخصت کریں گے"۔

''آپ کی زبان مبارک ہو۔اللہ کرے۔خوش اسلوبی سے دن سدھارے۔اور بیٹی سسرال چلی جائے۔"

اُسی لمحے پیارے لال اور بچوں کو آتے دیکھکر کاکی جی بولی۔"

''تم بے جا پریشان ہو رہی تھی۔دیکھو۔سب آگئے۔''

پیارے لال نے ہال میں داخل ہوتے ہی سب کی خیروعافیت پوچھی۔ غزالہ جوتی ایک دوسرے کو بوسے دیتی رہیں سب کے چہروں پر رونق آگئی۔پھر کچھ

دیر بعد پیارے لال روپیوں کا ایک بنڈل جیب سے نکال کر میر صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔"

''غزالہ بیٹی کی شادی ہے۔ ہم دل کھول کر خرچ کریں گے"۔

''مگر پیارے لال"۔

''اگر مگر کچھ نہیں۔ میں نے جوتی اور غزالہ میں کبھی کوئی فرق نہیں جانا"۔

میر صاحب آگے ایک لفظ نہ بول سکے۔ دیر تک گھر میں جمگھٹا سا رہا۔ اور وہ شادی کی تیاریوں میں جُٹ گئے۔ ان ہی دنوں بم دھماکے ہونے لگے۔ اکا دکا جگہوں پر لوگ مارے بھی گئے۔ کچھ لوگ منافرت کو ہوا دیکر آپسی اخوت کو تار تار کرنے پر اکڑ گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے شورش کی آگ نے ہر جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دلوں میں ڈر بیٹھ گیا۔ شام ہونے سے پہلے ہی لوگ دروازوں پر کنڈیاں چڑھا دیتے۔

ایک شام موہن لال (کمپونڈر) کسی بیمار کو دیکھنے جا رہا تھا کہ راستے میں ہی اغوا ہو گیا۔ اُس کا معمول تھا کہ وہ ہر شام محلے کے بیماروں کو دیکھ آتا۔ کسی کو پل کسی کو انجکشن دیدیتا۔ بیمار بھی ایک دو دن میں بھلے چنگے ہو جاتے۔ اور اُس کو دُعائیں دیتے رہتے۔ تب دوا بھی خالص دوا ہی ہوتی۔ ملاوٹ کے بغیر۔ موہن لال کی اغوائی سے بستی کے سارے لوگ پریشان ہو گئے۔ انھیں اپنے بھائی چارے کی ڈور ڈھیلی پڑتی نظر آ رہی تھی۔ کاکی جی کچھ عورتوں سمیت اُس سنسان جگہ کی طرف ننگے پاؤں ننگے سر دوڑ گئی۔ جہاں اُس کے ہونے کا امکان تھا۔ کاکی جی کو دور سے ہی آتے دیکھکر وہ کھسک گئے۔ انکے چہرے کالی پٹیوں سے ڈھانپے ہوئے تھے۔ جو دُور سے دکھائی دے رہا تھا۔ مگر وہ کون تھا جس کی شہ پر بھائی چارے کو تار تار کرنی کی کوشش ہو رہی تھی۔ کس نے موہن لال اور کاکی جی کے دل میں خوف پیدا کرنے کی سازش کی۔ کیوں وہ ہمیں الگ الگ کرنا چاہتا تھا۔ یہ ایک معمہ ہے۔ موہن لال صحیح سلامت

گھر تو پہنچ گیا۔لیکن اُس کے دل میں نہ مٹنے والا ڈر بس گیا۔ وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

وہاں غزآلہ کی شادی میں کچھ ہی دن باقی رہ گئے تھے۔سب تیاریاں ہو چکی تھیں۔کاکی جی برابر اُس رات کی شام تک غزآلہ کے پاس رہی۔اُس کو پاگلوں کی طرح بوسے دیتی رہی۔

''بس تم رخصت ہونے ہی والی ہو''۔کاکی جی کے منہ سے یہ الفاظ کیا نکلے۔غزآلہ زاروقطار رونے لگی۔کاکی جی کی گود میں سر رکھ کر بولی۔

''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔تم میری سانسوں میں بسی ہو۔یہ جسم سانس کے بغیر مُردہ پڑ جائے گا''۔

''بیٹی یہ دن عورت کی زندگی میں ایکبار ضرور آتا ہے۔جب وہ اپنوں سے دور چلی جاتی ہے۔پرائے گھر، پرائے ماحول اور پرائی بستی میں۔

اُس رات پیارے لاؔل، جوتی، بھوش نظر نہیں آئے۔اب کاکی جی بھی گھر لوٹ گئی تھی۔وہ رات کچھ زیادہ ہی سیاہ تھی۔اُلووں کی اُوں۔اُوں کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں۔کتوں کی ہڑ بونگ بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔اُس رات جاتے وقت کاکی جی بار بار مڑ کر غزآلہ کو دیکھتی رہی۔جس کے ساتھ وہ پیار و محبت کے بندھن میں بندھی ہوئی تھی۔مگر اُسی رات وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چلی گئی۔دُور۔اپنوں سے دُور۔غزآلہ سے دُور۔سحر ہوتے ہی غزآلہ جان گئی کہ اُس کی کاکی جی اُسکو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔کسی انجانے شہر میں۔اُس نے کلائی کی چوڑیاں توڑ دیں۔وہ سدھ بدھ کھو گئی۔اور دیوانی سی دریچے پر بیٹھ کر بڑبڑاتی رہی۔

''کاکی جی میں انتظار کروں گی''۔



آس

علی نے مین چوک کی گلی کی نکڑ پر ایک دکان کرایہ پر لی تھی جو سجی سجائی دلہن کی طرح پُرکشش، ہر راہگیر کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اُس نے انمول ادبی کتابیں، رسالے، تاریخی نوشتے سبھی کے استفادہ کے لئے طاق بہ طاق سجائے رکھے تھے۔ لوگ ان کا مطالعہ کرتے تو وہ بے حد خوش ہو جاتا۔ نزدیک جامع مسجد کے گول گنبد اور آستان کے بلند و بالا مینار جن کے ٹمٹماتے بلبوں کی روشنی دکان کے کونے کونے کو روشن کرتی، بہت پُر رونق لگ رہے تھے نزاکت یہ کہ پاس کھڑے صدیوں پرانے چنار اپنی چھاتی سے ٹھنڈک اُگلنے اور رہگیروں کو سایہ فگن کرنے میں کوئی بخل نہیں برتتے ٹھیک علی کی طرح۔ جو ایک اُدھیڑ عمر کا آدمی چنچل مزاج اور خدمتِ خلق کو جس نے مقصد حیات بنایا تھا۔ ہر مکتب فکر کے ساتھ حالات پر تبادلہ خیال کرنا اُس کا معمول بن چکا تھا۔ اور اس فکری بحث و مباحثے میں ہر کسی کو زبان بریدہ کر دیتا۔

اُس کا ایک نرالا انداز تھا۔ سر پر ایک ترچھی وضع دار ٹوپی اور انوکھے رنگوں کی صدری میں ملبوس، بڑی ٹھاٹ باٹ سے دکان پر بیٹھا رہتا۔ لیکن حلیمی اور نرمی میں دوسرا کوئی اُس کا ہم سر نہیں دیکھا گیا۔ ایک تقسیم کار صبح سویرے آ کر مختلف اخبار اُس کو تھما دیتا تھا اور وہ ان اخبارات کو تقسیم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں کرتا۔

اس دکان پر روز ایک بڑی بھیڑ نظر آتی تھی۔ کچھ اخبار لیتے تھے اور کچھ کھڑے

کھڑے اخبار پڑھ لیا کرتے تھے۔ لیکن خوش خلقی سے پیش آنے کا سبق کوئی اُسے سیکھے۔ وہ لوگوں کو حالات سے باخبر رہنے کے لئے کہتا، جو پل پل بدلتے رہتے تھے۔ ایسے بے رحم سماں میں کب کس کے بیٹے کو جیل کی کال کوٹھری میں قید کیا جائے، کب کس ماں کے چہیتے کی نعش چوراہے پر پھینک دی جائے، کب کون دلہن خاوند کی میت پر کلائی کی چوڑیاں توڑتی اور خونِ جگر بہاتی نظر آئے۔ کسی کو خبر نہیں۔

''ایسا ناگہانی بلا وا کسی کو نہ آئے"۔ وہ دُعا کرتا رہتا۔

وقت کے ایک بھیانک پل نے علی کے لختِ جگر کو فضاؤں میں اُڑتے ایک تنکے کی طرح اُس کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ دُور تاروں کی جھرمٹ میں کسی بھٹکتے تارے کی مانند۔ جہاں کوئی پرسان حال نہیں۔ سب بے زبان انجان سے۔

علی کا بیٹا اُسکو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور وہ اُسکی تلاش میں در در بھٹک رہا تھا۔ بیٹے کا گھر سے فرار ہونے کا غم اس کے چہرے سے صاف صاف جھلک رہا تھا

اُس نے دکان عوامی خدمت کے جذبے کے تحت ہی کھول رکھی تھی۔ وہ زیادہ تر سماجی کام ہی کرتا رہتا۔ بینک میں لوگوں کے کھاتے کھولنے، آتے جاتے مسافر گاڑیوں کے کنڈیکٹروں کو ریزگاری دینے میں اُسے بے حد خوشی محسوس ہوتی۔ گاؤں میں کوئی موت ہو جاتی تو وہ فوراً لوگوں کو آگاہ کر دیتا۔ کفن دفن کے انتظامات بھی کر دیا کرتا۔ کمتری کا ذرا بھر احساس نہیں تھا اُسکو۔ وہ بڑی خوش اسلوبی سے ہر کسی کا کام انجام دیتا۔

گاہے گاہے میں بھی اپنے کام اُس کو سونپ دیتا تھا۔ ایک بار دن کے کسی بے نام پہر میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اکیلا دکان پر بیٹھا تھا۔ بہت پریشان لگ رہا تھا مجھے گلے لگا لیا۔ پھر میرے کندھوں پر سر رکھکر روتے بلکتے ہچکی بھرے لہجے میں

بولا۔

"ماسٹر۔ جانے کس کے بہکاوے میں آکر وہ عیش وعشرت کی زندگی پر لات مار کر چلا گیا۔ تم تو جانتے ہو، کتنی منتیں مانگی تھیں اُس کے لئے۔"

میں نے شانے تھپتھپا کر جو اُس کا حوصلہ باندھنے کی کوشش کی۔ وہ رائیگان ثابت ہوئی۔ وہ برابر روئے جارہا تھا میں اسے دکان کی پُشت پر بہتی صاف شفاف ندی پر لے آیا۔ مُنہ ہاتھ دھوکر وہ ایک دم تازہ ہوگیا۔ ہم دکان پر واپس آئے اُسکا نور نظر جو بچپنے میں ایک انقلابی تحریک سے منسلک ہوگیا تھا۔ بڑی دیر تک موضوع بحث بنا رہا۔ جو سر بکف گھر سے چل پڑا تھا۔ ایک انجان راہ پر۔ جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ اگر ہو بھی جاتی تو خون میں لت پت پڑی لاشوں کی۔

میں نے ایک دن اُس سے کہا۔ "تیار ہو جاؤ۔"

اختصار میں کہے یہ الفاظ اُس کی سمجھ میں نہ آئے۔ اس نے پوچھا۔

"ماسٹر پہیلیاں کیوں بُوجھتے ہو۔ صاف صاف کہہ دو۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو۔"

مجھے کہیں سے پتہ چلا تھا کہ سرحد کی کسی غیر محفوظ چوٹی سے کچھ نوجوانوں کو زندہ پکڑ کر جیل میں بند کر دیا گیا ہے اس جیل خانے میں قیدیوں کی ایسی درگت کی جاتی کہ وہ چلنے پھرنے کے لائق نہیں رہ جاتے انکی زندگی وبالِ جان بن جاتی۔ بے چارے فریاد کریں تو کس سے۔ سُننے والوں نے روئی کانوں میں ٹھونس رکھی تھی۔

علی جیسے نیک سیرت اور بے لوث انسان کی دادخواہی اس بے رحم سماج میں کون کرتا۔ وہ تو سرحد پر کھینچی لکیر کو کوستا رہتا جس کو پار کرنے کی غرض سے نہ جانے کتنے نوجوان گھروں سے چل پڑے تھے۔

"کاش! لوگ آزادی سے زندگی جینے کی اہمیت سمجھ جاتے تو زمین پر لگی یہ

سرحدی لیکریں مٹ جاتیں اور کب کے بچھڑے اپنے اپنوں سے مل جاتے"۔

علی بڑ بڑا رہا تھا۔

"لغزش تو ہوتی ہیں۔ کیا ہم ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف نہیں کر سکتے ہیں؟۔ کیا ہم دلوں کی دُوریوں کو کم کر کے دوستی نہیں کر سکتے ہیں؟"۔

یہ سوالات علی کے دماغ میں اکثر انگڑائیاں لے رہے تھے۔

علی ایک نیک انسان تھا اور لوگوں کے کام نپٹاتے نپٹاتے اُسکے بال سفید ہو چکے تھے۔ لیکن ماتھے پر کبھی شکن تک آنے نہیں دی۔ ایک لمحے پہ میں نے اس سے کہا۔

"تم میرے ساتھ جیل خانے چلو"۔۔

اُس کی آنکھوں سے عجیب سی اضطراری کیفیت جھلکنے لگی۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ہم جموں کے سفر پر چل پڑے۔ اسٹیشن پر اُتر کر آٹو کرایہ پر لیکر جیل خانے پہنچ گئے۔ یہاں چاروں اطراف لمبی لمبی اونچی اونچی دیواریں دیکھکر اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بولا۔

"یہاں تو چاروں طرف خاموشی ہے"۔

وہ کڑے پہرے دیکھکر سوچنے لگا۔

"یہ کیسا جیل خانہ ہے قبرستان کی طرح سنسان۔ ظاہر ہے کہ پہرے دار کڑک اور سخت ہونگے"۔

مجھ سے کہا۔

"ماسٹر۔ آپ نے بڑی بڑی کتابیں پڑھی ہیں۔ آج آپکے امتحان کا دن ہے۔ کوئی سبیل سوچو۔ اگر میرا بیٹا یہاں ہو تو کیسے چھڑا کے لیجائیں گے"

ہم جیل سُپر نٹنڈنٹ کے آفس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تو علی کی سانسیں تیز ہونے لگیں اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں اس کو دلاسا دیتا رہا۔ آفس تک پہنچتے

پہنچتے متعدد بار جامہ تلاشی لی گئی۔ گیٹ پر تعینات ہٹے کٹے اردلی کی خوفناک مونچھوں سے ڈر کر اس کے قدم رُک گئے۔ میں نے کہا۔

''گھبراؤ مت علی۔ تم اُدھیڑ عمر کے آدمی ہو۔ اور ایک سماجی کارکن ہو"۔ یہ سُن کر وہ برہم ہو کر بولا۔

''ماسٹر۔ وہ وقت یاد کرو جب بیچ چوراہے ایک آفیسر کو وردی پوش اہلکاروں نے گھیر کر اس کا تماشا بنایا تھا اور پیٹ پیٹ کر مداری کے ریچھ کی طرح اُچھل اُچھل کر ناچنے پر مجبور کیا تھا۔ کون کون سا زخم کُرید کر دِکھاؤں۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور روہانسی آواز میں اسکو خاموش ہونے کے لئے کہا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ کے آفس کو بڑی فن کاری سے سجایا گیا تھا۔ جیسے اس خطہ سر زمین کے تمام دیدہ زیب مناظر کو آفس نے اپنی بانہوں میں سمیٹ رکھا ہو۔ ہم کیبن میں داخل ہوئے۔ علی عاجزانہ لہجہ میں مخاطب ہو کر بولا۔

''صاحب سُنا ہے کہ آپ نے سرحد سے کچھ نوجوانوں کو پکڑ کر جیل خانے میں بند کر دیا ہے۔ صاحب میرا بیٹا گھر سے فرار ہوا ہے۔ شاید وہ آپ کی جیل میں پڑا ہو۔ میں ایک نظر دیکھ لینا چاہتا ہوں۔"

پوچھ گچھ کے بعد ہمیں اندر جانے کی اجازت دی گئی۔ لیکن علی کا بیٹا ان نوجوانون میں شامل نہیں تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تو صاحب نے حوصلہ دلا کر کہا۔

''اگر آپ کے بیٹے کا کوئی سُراغ ملا تو ضرور اطلاع دُوں گا"۔

علی کی دکان بند پڑی تھی مگر سبھی رشتہ دار، دوست، ہمسایے رابطے میں تھے۔ ایک فون کال پر وہ حواس باختہ ہو گیا۔

میں نے پوچھا۔

''ایسی کیا بات ہے کہ تم اتنے پریشان ہو گئے"۔اس نے سامان باندھنا شروع کیا اور ہم گھر کی طرف چل پڑے۔سفر کی سختیاں جھیلتے جھیلتے بالآخر ہم گاؤں کی سرحد پر پہنچ گئے۔چاروں طرف خاموشی تھی پرندے بھی درختوں کی ٹہنیوں پر گھبرائے سہمے بیٹھے تھے۔چہرے اُداس تھے۔علی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''آخر کون سی بات مجھ سے چُھپا رہا ہے"

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔بدن پر ملبوس صدری اُتار کر تار تار کرنے لگا۔

میں نے سوچا۔

''شاید علی کے بیٹے کو پکڑ لیا گیا ہے یا خدانخواستہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

آسمان گھنے بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔جیسے دن میں اندھیرا چھانے لگا ہو۔ آہستہ آہستہ ہم گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔لوگوں کی چیخ پکار سنائی دینے لگی۔مرد وزن زار وقطار رو رہے تھے۔اور عورتیں سینہ کوبی بھی کر رہی تھیں۔کچھ آستانے کی چوکھٹ پر سر پٹخ پٹخ کر رو رہی تھیں۔آس پاس کے علاقوں کے بے شمار لوگ موجود تھے۔ قبرستان میں سفید کفن اوڑھے لاشیں پڑی تھیں۔پولیس اہلکار بھی تعظیماً ٹوپی اُتار کر لاشوں کے چاروں طرف پریشان سوچ میں ڈوبے لگ رہے تھے۔کہ اچانک کسی نے آواز دی۔

''وہ دیکھو علی آ گیا۔"

لوگوں میں ہل چل مچ گئی۔سب نم دیدہ علی کو دیکھ رہے تھے۔اُس نے لہولہان پڑی لاشوں کو دیکھا تو نعرے گونج اُٹھے۔

''بند کرو۔بند کرو۔خون خرابا بند کرو"۔سب یک زبان ہوئے۔

''کب یہ قتل عام بند ہوگا اور ایک نئی صبح رُو پہلی کرنیں بکھیرتی نئے سورج کے

طلوع ہونے کی نوید لے کر آئے۔خدا جانے"۔

اِن لاشوں کو اجتماعی قبر میں دفنایا گیا۔تو کسی نے پھر آواز دی۔

''پاس والے گاؤں میں کچھ اور لاشیں لائی گئی ہیں۔"

علی اس بھیڑ کو صرصر کی طرح چیرتا ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا وہ اُس گاؤں کی طرف چل پڑا۔اس نے لاشیں دیکھیں۔اجنبی لاشیں۔

پھر وہ در در جا کر بیٹے کو پکارتا رہا اور اُس کے لوٹنے کی آس بندھی رہی۔

☆☆☆

رات کے مسافر

دن بھر چلچلاتی دھوپ کی تپش سے پسینے پسینے ہو کر جسم میں تھکاوٹ سی آ گئی تھی۔ہم کالج کے احاطے میں بیٹھ کر سستانے لگے۔ غالباً کام کے تعلق سے سامان حاصل کر چکے تھے۔ایک الیکٹرانک ووٹنگ مشین اور چناؤ سے متعلق کاغذات۔ہم وہیں بیٹھے بیٹھے ان کاغذات کی جانچ میں جُٹ گئے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میرے عملے کا ایک کم عمر ملازم بولا۔

''سر۔وہ بڑا احساس علاقہ ہے۔میں جانے سے ڈر رہا ہوں"۔

اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ بدحواس سا ہو گیا۔جبھی میں نے اُس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''تم گھبراؤ مت۔میں تمہارے جسم پر خراش تک آنے نہ دوں گا"۔

وہ بدستور تذبذب میں پڑا رہا۔اُس کی آنکھوں سے صاف صاف جھلک رہا تھا۔ کہ وہ پریشانی کے کسی گہرے سمندر میں ڈوبے جا رہا ہے اور جیسے جان کنی کی حالت میں ''بچاؤ۔بچاؤ" کی صدائیں دے رہا ہو۔میں نے اس کو آواز دی۔

''جاوید" وہ چونکتے ہوئے بولا۔

''سر۔وہ بڑے بڑے پتھر ہاتھوں میں لئے بیٹھے ہونگے"۔

میں نے اُس کی پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔

''ایک رات ہی کی تو بات ہے۔باتوں باتوں میں کٹ جائے گی۔"

وہ تلملایا۔ "سر۔ یہ رات نہیں قیامت ہوگی"۔

اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"اللہ پر بھروسا رکھو۔ ہم صحیح سلامت گھر لوٹیں گے۔ دیکھو۔ ڈپٹی کمشنر صاحب بھی کہہ رہے تھے کہ ہماری حفاظت کے لئے پورا بندوبست کیا گیا ہے۔ چلو! رخت سفر باندھ لو۔"

وہ سفر کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"بھیس بدل کر چلو۔ ایسا لگے کہ ہم عام مسافر ہیں۔ اور وہ ہماری گاڑی کو جانے دیں"۔

انھوں نے میری رائے میں ہی جان کی سلامتی سمجھی۔ وہ بھیس بدل کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اُس وقت کالج میں بہت بھیڑ تھی۔ سبھی کے چہروں پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے سبھی کو کسی قتل گاہ کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔ اور ڈر کے مارے وہ ا یکدوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ ایک دوسرے کو سلامتی کی دعائیں بھی دیتے رہے۔ میں پریشانیوں کے بھنور میں ڈوبے جا رہا تھا۔ بات فکر کی ہی تھی۔ اور خوف ہراس کا ہونا واجب تھا۔ کیونکہ چندروز پہلے ہی ایک ملازم الیکشن ڈیوٹی کرتے کرتے گولی کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔ گولی کس نے چلائی اس بات کا کچھ علم نہیں۔ مگر اس ملازم کی موت پر چارسو واویلا ہوا۔ آنسو بہائے گئے۔ وہ بے چارہ اس بے درد سماج میں بچوں کو روتے بلکتے چھوڑ کر چلا گیا۔ دُور۔ کسی انجانی دنیا میں۔ مجھے بیقراری سی ہوئی۔ اور آنکھیں نم۔ گھر سے نکلتے وقت میری بیٹی مجھ سے لپٹ کر بولی تھی۔

"پاپا۔ میرے لئے چاکلیٹ لیتے آنا۔"

وہ معصوم اس بات سے بے خبر تھی کہ کیا اِن کے پاپا گھر لوٹیں گے بھی۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے انھیں پونچھ ڈالا۔ سوچا۔

"کہیں میرے ساتھی کم ہمت نہ پڑیں۔"

رات شروع ہونے ہی والی تھی۔میں نے جاکر کونٹر سے کھانے کی چیزیں لے لیں۔کیلے، انڈے، بسکیٹ۔یہ رات گزارنے کے لئے کافی تھے۔اتنے میں کالج کا صدر دروازہ کُھل گیا۔اور اشارہ پاتے ہی ہم نکل پڑے۔منڈ جی کی اور۔جہاں ہمارا پولنگ اسٹیشن تھا۔سفر زیادہ لمبا نہیں تھا لیکن ہمیں لگ رہا تھا کہ شاید یہ سفر آخرت ہے۔نوکری پس از گدائی بزرگوں نے خوب کہا ہے۔کچھ حساس علاقوں سے گزر کر آخر ہم اسٹیشن پر پہنچ گئے۔میں نے سامان کمرے میں رکھوا کر اطمینان کی سانس لی۔ہم تھکے ہارے دیوار سے ٹیک لگائے پاؤں پسارے بیٹھ گئے۔میں نے چوکیدار سے، جو اضطراری حالت میں تھا' سے پوچھا۔

"یہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہے،"

وہ میرے سوال کا جواب دینے سے کتراتے نظر آیا۔اُس کی بے چینی دیکھ کر خدشات پیدا ہونے لگے۔میں نے پھر پوچھا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

اُس نے جلد بازی میں کہا۔

"صاحب! باتھ روم عمارت کے دائیں سرے پر ہے۔میں چابی رکھ دیتا ہوں۔پانی کا انتظام کر کے رکھ دیا ہے۔میں بازار ہو کے آتا ہوں۔چائے کے لئے دودھ لیتا آؤں گا"۔

اور وہ آنکھ جھپکتے ہی اوجھل ہو گیا۔میں تذبذب میں پڑ گیا۔میرے ساتھی بھی متفکر ہوئے۔میں کمرے سے باہر آیا اور برآمدے میں بیٹھ کر سوچنے لگا۔کچھ توقف کے بعد چند نوجوان آکر شرارت بھرے لہجے میں بولے۔

"یہ ہمارا علاقہ ہے۔یہاں سے چلتے بنو۔"

میں نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ میں اپنی جگہ پر بنے رہا۔اور اس علاقے کی قدرتی خوبصورتی کا جائزہ لیتا رہا۔ پہاڑی کے دامن میں یہ چھوٹا سا گاؤں دل میں اس طرح رچ بس گیا۔ کہ ایک لمحے کے لئے سوچا کہ کیوں نہ ہمیشہ کیلئے یہاں ڈھیرے ڈالدوں۔ لیکن یہ اغلب نہیں تھا۔ اندھیرا آہستہ آہستہ روشنی پر حاوی ہوتا جارہا تھا۔ میں جونہی کمرے میں جانے لگا۔ یہ نوجوان الٹے پاؤں پھر کر اب کی بار بڑے غصے سے بولے۔

''یہ جگہ خالی کردو۔اور واپس اپنے گھروں کو چلے جاؤ''۔

میں نے بہت ہی نرم لہجے میں اُن سے کہا۔

''ایک رات کی بات ہے۔صبح کام نپٹا کر چلے جائیں گے''۔

ایک نے کہا۔''ہم کیسے یقین کریں کہ صبح کو چلے جاؤ گے''۔

اس نے پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"

''وہ جو پہاڑی پر لوگ ڈھیرا جمائے بیٹھے ہیں نا۔انھوں نے بھی کہا تھا کہ ہفتہ عشرہ کے لئے آئے ہیں۔اتنے سال بیت گئے۔وہ جانے کا نام نہیں لیتے۔ناحق پریشان کر کے رکھا ہے۔ ہمارا علاقہ ہے ہمیں کو گھومنے پھرنے کی ڈھیل نہیں۔وہاں جو بھی گیا لوٹ کر نہیں آیا۔ان کی مائیں آس لگائے بیٹھی ہیں کہ انکے لخت جگر آئیں گے۔بھلائی اسی میں ہے کہ چپ چاپ چلے جاؤ''۔

وہ بدگمان سے لگ رہے تھے۔میں نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''صبح کو چلے جائیں گے''۔

انکے تیور بُری طرح بگڑ گئے۔میں کمرے میں جا کر چناوی کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔میرے ساتھی دوسرے کاغذات دیکھ رہے تھے۔کہ اچانک ان نوجوانوں نے دھاوا بول کر پولنگ اسٹیشن پر پتھر برسانے شروع کردیئے۔ کھڑکیوں کے شیشے

چکنا چور ہو کر ہمارے سروں پر اولوں کی طرح گرتے رہے۔ جاوید پھر حیران و پریشان ہو کر بولا۔

''سر۔ خطرہ بڑھ رہا ہے۔ محافظوں کو بُلا لیجئے''۔

ہمارے ساتھ پولیس کے دو رنگروٹ بھی ڈیوٹی کر رہے تھے۔ انکے ہلنے ڈھلنے کی کہیں سے آواز نہیں آئی۔ وہ بغل والے کمرے میں ہی دبک کر رہ گئے۔ شاید انکی سانس حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔ دوسرے کچھ محافظ پہاڑی کے دامن میں آڑ لئے چُھپ گئے تھے۔ اس بیچ چوکیدار چُھپتے چُھپاتے آ کر بولا۔

''صاحب! آپ یہاں محفوظ نہیں ہیں''۔

میں فکر میں پڑ گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے سیکٹر مجسٹریٹ اشفاق صاحب سے رابطہ کر کے انھیں کہا۔

''ہم کسی بھی طور یہاں محفوظ نہیں ہیں''۔

انھوں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔"

''ہم بڑے صاحب کو خبر دیں گے۔ آپ اطمینان سے رہیں۔ آپکی اسکورٹی بڑھا دی جائے گی''۔

اس بات پر جاوید بوکھلا کر بولا۔"

''سر۔ وہ بڑے صاحب کو خبر دیں گے۔ پھر بڑے صاحب اپنے بڑے صاحب کو اور وہ اپنے بڑے صاحب کو۔ تب تک یہ اس الیکٹرانک ووٹ میشین کا چورا اور ہمارا قیمہ بنائیں گے۔ ہمیں بے سہارا چھوڑ دیا گیا ہے''۔

وہ کچھ اور کہنے والا تھا کہ اچانک کہیں سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔

''ٹھک۔۔ٹھک۔۔۔۔ٹھک"

گولیاں قریب سے ہی چلیں۔ اور اس گپ اندھیرے میں شور و غل سنائی دیا۔"

پکڑو۔۔۔۔۔پکڑو۔ان نوجوانوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ایک ایک لمحہ قیامت جیسا گزر رہا تھا کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کریں تو کیا کریں۔"

میں نے جاوید سے کہا۔

''دروازے پر کنڈی لگادو۔یہ رات جوں توں کر کے گزارنی ہے۔

وہ دروازہ بند کر کے آیا اور میرے سامنے زانو بہ زانو بیٹھکر بولا۔

''سر۔حال ہی میں میری ایک بیٹی ہوئی ہے اگر خدانخواستہ کچھ ہوگیا۔تو لوگ زندگی بھر اُس کو منحوس ہونے کے طعنے دیں گے۔سر۔یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

عین اُسی لمحے پھر سنگباری شروع ہوئی۔اب کے بڑے بڑے پتھر پھینکے جارہے تھے کھڑکیوں کے پٹ بھی ہلنے لگے۔اور وہ نوجوان چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔

''ہمارا علاقہ خالی کرو۔واپس چلے جاؤ۔''

میں نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر اُن سے کہا۔"

''بھائیو۔ہم رات کے مسافر ہیں۔رات گزار کر چلے جائیں گے۔"

میری اتنی سی بات پر وہ بھڑک کر خُرافات بکنے لگے۔صلواتیں سنانے لگے۔میں نے جلدی سے کھڑکی بند کردی۔پھر انکے چیخنے چلانے کی آوازیں بند ہوگئیں۔رات بہت ہوچکی تھی۔میں نے جاوید سے بستر بچھانے کے لئے کہا۔وہ بستر بچھانے ہی لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ہم گھبرا گئے۔اور چپ سادھنے میں ہی بھلائی سمجھی۔پھر کچھ لمحے بعد انھوں نے دروازے کو زور سے کھٹکھٹایا۔جی اندر سے بیٹھا جارہا تھا۔میں نے سوچا۔وہُی نوجوان ہونگے۔اب کے شاید گھسیٹ کر باہر کا راستہ دکھائیں گے۔میں نے ہمت جُٹا کر آواز دی۔

''کون ہے۔''

''صاحب میں چوکیدار ہوں۔''

اُس کی آواز صاف سنائی نہیں دی۔ میں نے اپنے اطمینان کے لئے پھر اُسے پوچھا۔

''اتنی رات گئے کیوں آئے ہو۔''

اُسی لمحے بندوق چھتیانے کی آوازیں بھی آئیں۔ جاوید کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ میں اُسے دلاسہ دے رہا تھا کہ بغل والے کمرے سے پولیس اہلکار بولا۔

''سر۔ ہمیں نکلنا ہے۔''

اُس کی آواز سنکر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ کوئی خطرے والی بات نہیں۔ میں نے بے فکر ہو کر جونہی دروازہ کھولا تو فوجی وردی میں ملبوس ایک صاحب سخت آواز میں بولے۔

''دوڑو اور گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔''

ہم چاروناچار گاڑی میں بیٹھ گئے۔ کیا معلوم کہاں لے جا رہے تھے۔ آگے پیچھے فوجی بندوق تانے گاڑی میں چلے آرہے تھے۔ ہم کو جان کے لالے پڑ گئے۔''

''کہیں کسی جانب سے گولی چلی تو یہ ہمیں ڈھیر کر دیں گے''

یہ وسوسہ تنگ کئے جا رہا تھا۔ رات کے کسی پہر میں ہم فوجی چھاؤنی میں پہنچ گئے۔ ہمیں آرام کرنے کے لئے سلیپنگ بیگ دیئے گئے۔ میں اس غرض سے اس کے اندر گھس گیا کہ کچھ پل کے لئے سو جاؤں۔ نہ جانے کب کا دُھلا ہوا تھا۔ میری نیند اُڑ گئی۔ میں صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کہ فوجیوں کی حرکتیں دیکھکر انکی بے بسی کا اندازہ ہونے لگا۔ ایک فوجی آنکھیں موندتے موندتے بستر پر اُٹھ کھڑا ہو کر بولا۔

''ارے ستیش، ذرا ٹی وی کی آواز کم کر دے۔ گھڑی بھر کو سونے دے''۔

ستیش کھلکھلا کر ہنس دیا۔ اُس فوجی نے غصے میں آ کر بستر پھینک دیا۔

"یہ بھی کوئی زندگی ہے" کہتے کہتے بیرک سے ہی چلا گیا۔ اسی دوران میں ایک فوجی اندر آیا۔"

"ہے۔ یادو، یوگندر۔ جرنیل اُٹھو۔ ڈیوٹی لگ گئی۔"

وہ ایک دم کھڑے ہو گئے۔ میں نے کروٹ کیا لی۔ نزدیکی بیڈ پر لیٹا فوجی بولا۔

"کیوں سر۔ کس کی یاد آ رہی ہے"۔

پھر اُسنے ایک لمبی آہ کھینچی۔

"میں نے ایک سال سے بیٹی کو نہیں دیکھا ہے اور آپ ایک ہی رات میں اتنا پریشان ہو رہے ہیں"۔

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپک گئے۔ میں ان کی زندگی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا۔ کہ پرندے چہچہانے لگے۔ ہمیں صبح تڑکے ہی پھر پولنگ اسٹیشن پر پہنچا دیا گیا۔ دن بھر مکھیاں اُڑاتے رہے۔ پولنگ کا وقت ختم ہوتے ہی میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"ہمیں لوٹنے کا حکم مل گیا ہے"

انھوں نے آوٗ دیکھا نہ تاوٗ۔ جھٹ پٹ سامان باندھ لیا۔ انکے چہرے چمکنے لگے۔ جاتے وقت ہمیں ایک فوجی کیمپ کے نزدیک ٹھہرایا گیا۔ وہ نوجوان ہمارے تعاقب میں وہاں تک پہنچ گئے۔ اور بہت قریب آ کر جھومتے ناچتے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہمارے لوٹنے سے ان کی جیت ہوئی ہو۔ ہم بُلٹ پروف گاڑیوں میں بیٹھکر کالج کی طرف نکل پڑے۔ راستے کی سختیاں جھیلتے جھیلتے آخر ہم کالج کے صدر دروازے پر پہنچ گئے۔ ہم اُتر ہی رہے تھے کہ اچانک گولیاں چلیں۔ چاروں طرف شور وغل مچ گیا۔ لوگ دوڑتے بھاگتے رہے۔ میں کچھ دیر کے لئے کھوسا گیا۔ پھر اچانک

مجھے میرے ہاتھ میں پڑے کنڑول یونٹ پر نظر پڑی۔ میں نیم خم ہو کر کالج کے اندر دوڑ گیا۔ کچھ کیڑوں کی طرح رینگتے رینگتے گاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کچھ کے سِروں پر پتھر لگے۔ اور خون ٹپ ٹپ ٹپک رہا تھا۔ ایک کی آنکھ پھوٹ گئی۔ ایک ٹانگ سے گیا۔ ایک کی ناک پتھر لگنے سے اندر کی جانب دھنس گئی۔ کیئوں نے گلے میں لٹکی ٹائیں پھیک دیں۔ کئیوں نے کوٹ بیگوں میں چھپالئے۔ اور کئیوں کے کپڑے پھٹ گئے جو ہو بہو بھکاری جیسے لگ رہے تھے۔ اس ہُو کے عالم میں میری نظریں جاوید پر پڑیں۔ جو دُور سے کہہ رہا تھا۔

''سر۔ رات ختم ہو چکی ہے۔"

میں اُس کو اُس وقت تک دیکھتا رہا جب تک نہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔



لینے کے دینے

وہ میڈم کے ہٹی رویئے کو جھیل رہی تھی۔ بے چاری۔ کرتی بھی کیا۔ بے بس تھی۔ نجمہ بی کو بیٹی کے مستقبل کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس کو حیلے بہانے سننے پڑتے تھے۔

''میں نے چپراسی کو بورڈ آفس بھیج دیا ہے۔ وہ مارکس سٹوفکیٹ لے آئے گا۔''

وہ ہفتہ عشرہ کے بعد آ جاتی تو بار بار یہی کچھ سُننے کو ملتا۔ اور چُپ چاپ گونگی بنی بیٹھی رہتی۔ میڈم تند مزاج اور ہٹیلی۔ اڑ گئی تو مخاطب کی خیر نہیں۔ مات کھانا قطعاً برداشت نہیں کرتی تھی۔ کچھ کچھ نرم دل بھی تھی۔ کسی کی ادا بھاتی، تو اُسکو اپنے سایہ عاطفت میں سیروں بادام، کھجور، پستہ، کشمش کھلا کر ہاتھی سا بنا دیتی۔

چار مہینے گزر چکے تھے۔ نجمہ بی کی بیٹی کا مارکس سٹوفکیٹ چپراسی لے آیا تھا۔ اور میڈم نے اپنی تحویل میں لے رکھا تھا۔ وہ اُس خرچے کی تمام بھرپائی طالبہ سے کرانا چاہتی تھی جو بورڈ آفس آنے جانے میں ادارے کو اُٹھانا پڑا تھا۔ فیس سمیت کچھ پانچ ہزار بنتا تھا۔

اُسنے جب یہ رقم نجمہ بی سے طلب کی تو نجمہ بی نے اعتراض جتا کر کہا۔

" میڈم۔ یہ غلطی ادارے کی ہے۔ میری بیٹی جُرمانا کیوں بھگتے"۔

مگر میڈم ہٹ پر آ گئی۔ وہ ایک رٹ لگائے بیٹھی۔

''پانچ ہزار"۔

مرغ کی ایک ہی ٹانگ۔ "پانچ ہزار تو بھرنے ہی بھرنے ہیں" اُسنے کہا۔ اس بات پر ان میں تو تو میں میں بھی ہوئی۔ اور نجمہ آپی نے جاتے ہوئے کہا۔

"کل ایک ہزار روپیہ لے کر آؤں گی۔"

یہ سنکر میڈم آگ بگولہ ہوئی۔ بادل کی طرح گرجی۔ میڈم کے بگڑتے تیور دیکھ، میں دم بخود ہوا اور سٹاف روم میں چلا گیا۔

اگلے روز جب نجمہ آپی گھر سے چل پڑی۔ اُسنے راستے میں ایک زیارت گاہ کی راہ لی۔ اور زیارت گاہ کی چوکھٹ پر سر ٹیک کر گریہ وزاری کرنے لگی۔"

"یا اللہ، میڈم کو ہم پر رحم آئے۔ یا اللہ، میری بیٹی کا کام بن جائے"۔

وہ ہاتھ پھیلائے اس کی بغل میں بیٹھی اپنی معصوم بیٹی کے لئے دُعا کرتی رہی۔ اور آبدیدہ نیلے آسمان کی طرف دیکھتی رہی۔ آسمان کی وسعتوں کا جائزہ لے کر اپنی بیٹی کو بغور دیکھنے لگی۔ بیٹی کی رونی صورت دیکھ کر بے صبر سی ہوگئی۔ اُسنے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا کر کھول دی اور اندر پتھریلی راہ پر چل پڑی۔ ارم بھی چپکے سے اپنی ماں کے پہلو بہ پہلو چلتی رہی۔ وہ روضے کے قریب جا کر ٹھہری۔ اور ہاتھ دیوار پر مَل مَل کے اپنی بیٹی کے مُنہ پر پھیرتی رہی۔ ارم معصومیت سے ماں کی ممتا پر سوچتی رہی۔ اور پھر ماں سے کہا۔"

"آج اللہ میاں نے آپ کی سن لی ہوگی"۔

"بیٹی۔ اب بہت جھیل لئے ہم۔"

اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ارم نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"میری قسمت ہی خراب ہے۔""

"بیٹی۔ قسمت کو مت کوسو۔ میڈم کب تک حجت کرے گی۔ آج مارکس سٹیفکیٹ دینا ہی پڑے گا"۔

اور دونوں اُس سکول کی طرف چل پڑیں۔ جہاں ارم پچھلے دو سال سے زیر تعلیم تھی۔تب میڈم نے خوشی خوشی طالبہ کو اپنے ادارے میں داخلہ دیا تھا۔حالانکہ داخلہ کے لیے لازمی دستاویزات بھی پورے نہ تھے۔اس کے باوجود جب میڈم نے داخلہ پر حامی بھرلی تو ماں بیٹی کی باچھیں کھل گئیں تھیں۔

''آپ کا مارکس سٹیفکیٹ لے کر ہی رہوں گی۔"

چلتے چلتے نجمہ بی اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھی۔

''آج پھر اڑ گئی تو میں بھول جاؤں گی کہ وہ اس ادارے کی سرپرست ہے''

ارم نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ماں آپ ایسی کوئی حرکت نہیں کروگی جس سے میڈم ناراض ہو جائے''

ارم نے گیارہویں جماعت کا امتحان امتیازی پوزشن لیکر پاس کیا تھا۔ پھر بارہویں میں داخلہ لیا۔اس وقت وہ ہشاش بشاش تھی۔ہنستے کھیلتے سال گزر گیا۔وہ بارہویں کے امتحان میں کامیاب ہوئی۔تو گھر میں خوشیاں آمڈ آئیں۔ دوست احباب،عزیز واقارب مبارکبادی دینے آئے۔مٹھائیاں بانٹی گئیں۔گھر میں جشن کا سا سماں تھا۔اور نجمہ بی نے مہمانوں کی خوب خاطر مُدارات کی۔

ارم کالج جانے کیلیئے بے تاب ہو رہی تھی۔لیکن جب بارہویں کا نتیجہ آنے کے بعد وہ مارکس سٹیفکیٹ حاصل کرنے آئی معلوم پڑا کہ بورڈ حکام نے سٹیفکیٹ اجرا ہی نہیں کیا ہے۔دراصل اسکول سے ارم کے مارکس ایوارڈ بورڈ آفس میں داخل ہی نہیں کیے گئے تھے۔ارم کے والدین آپے سے باہر ہوئے۔اور اسکول میں ہنگامہ ہوا۔لیکن میڈم نے اپنی چترتا سے انکے اُبلے جنون کو ایکدم یخ کی طرح ٹھنڈا کر دیا۔وہ انھیں فی الحال ٹرخانے میں کامیاب ہوئی تھی۔اُنکے جاتے ہی میڈم نے امتحانی کام سے منسلک اُستاد کو کمرے میں بُلوایا۔بس۔۔۔۔۔پھر آسمان سے جیسے بجلی گری۔وہ برس

پڑی۔ آفس میں سکوت چھا گیا پھر استاد جیسے کسی مجرم کی طرح کالے کپڑوں میں ملبوس سزا سننے کے لئے کھڑا ہوا ہو۔ بے چارہ استاد سرتاپا پسینے میں شرابور ہوا اور ماتھے سے کسی آبشار کی طرح پسینہ چھوٹتا رہا۔

وہ ایک فرض شناس اُستاد تھا۔ ہر فن مولا۔ نفاست پسند اتنا کہ ریکارڈ روم کو خود جھاڑو دیا کرتا تھا۔ دیواروں اور پردوں کی صفائی کا بھی خاص خیال رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ریکارڈ روم میں صفائی والا خال خال ہی نظر آتا تھا۔ ایک ہمدردی کا پتلا، طلباء پر جان چھڑکنے والا۔ غریب طلباء کی فیس کبھی کبھی اپنی جیب سے بھی ادا کرتا تھا۔ لیکن زمانے کی ستم ظریفی کو کیا کہیے۔ بے چارہ۔ نقل مکانی کے چکر میں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا تھا۔ اور الجھنیں دماغ پر بھوت پریت کی طرح سوار رہتی تھیں۔ ادھیڑ عمر میں تدریسی عمل کے علاوہ دفتری ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوئے تھا شاید اسی لیے بھول بیٹھا۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ اس عمر میں حافظہ کمزور ہونے لگتا ہے۔ بے چارے پر میڈم کے مہینوں کا نزلہ ایسے گر گیا کہ چھٹی کے اوقات سانپ کی طرح ڈسنے لگے۔ اتوار کا دن تھا بے چارے کے ہاتھ ریکارڈ روم کا کونہ کونہ چھان کر فائیلوں کی گرد سے کوئلے کی طرح کالے ہو گئے۔ اور بے حسی میں جب قمیض پتلون پر ہاتھ پھیر دیتا تو کالے دھبے صاف شفاف لباس کو بے رونق کئے دیتے تھے۔ ارم کی فائل ہاتھ لگتے ہی، اسکے مایوس چہرے پر مسکراہٹ کِھل اُٹھی۔

دفتری طوالت کے بعد آخر کیس کو حل کروا ہی دیا۔ اور ادارے سے ایسے غائب ہو گیا جیسے چاند گپ اندھیری راتوں میں غائب رہتا ہے۔

اس محکمے میں اب فرض شناس لوگوں کی عزت وتوقیر کم ہی کی جاتی ہے اور اِن سے ایسے القاب منسوب کئے جاتے ہیں کہ بے چارے دَبک کے رہ جاتے ہیں۔ جبکہ کام چور، چاپلوس اور خوشامدیوں کی ستائش اور سراہنا ہوتی ہے۔

نجمہ بی ایک لمبی مسافت طے کر کے ادارے کے احاطے میں پہنچ گئی۔ اور میڈم کے آفس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب میڈم کی نظریں اُس پر پڑیں۔ تو وہ لال پیلی ہوگئی۔ اُسنے چپراسی جو انتظامی معاملات میں میڈم کا مشیر خاص تھا' کو بُلا کر ہدایت دی۔ اُسنے نجمہ بی کو انتظار کرنے کو کہا۔ وہ بنچ پر بیٹھی رہی اور طلباء کو اُچھل کود کرتے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد میڈم نے کرخت لہجے میں چپراسی کو پھر بُلا لیا اور ایک ہدایت نامہ تھما کر سٹاف روم میں بھیج دیا۔ تو نجمہ بی موقع غنیمت جانکر اندر گھس گئی اور میڈم سے بولی۔

''خدا کے واسطے مارکس سٹرفکیٹ دلوا دیجئے۔"

میڈم نے چپراسی کو بُلا کر کہا۔

''اس کا مارکس سٹرفکیٹ لا کر دو۔ اور ہاں پانچ ہزار روپے لے لینا۔''

نجمہ بی عاجزی سے بولی۔

''میں غریب پانچ ہزار کہاں سے لاؤں۔ کچھ انصاف تو کرو۔''

''پانچ ہزار بھرنا ہی بھرنا ہے"۔ میڈم نے پھر کہا۔

نجمہ بی نے چھوٹا سا کالا پرس نکالا اور سو سو کے دس نوٹ گن کر میڈم کی طرف بڑھا کر کہا۔

''میرے پاس اتنا ہی ہے، چاہو تو جامہ تلاشی بھی لے سکتی ہو۔"

میڈم نے غصے میں آ کر دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

''کوئی رعایت نہیں کروں گی۔"

نجمہ بی نامراد ہو کر برآمدے میں جا کر بیٹھ گئی۔ کچھ توقف کے بعد میں وہاں سے گزرا۔ تو اُسنے دبی زبان سے کہا۔

''جناب۔ آپ میری مدد کیجئے۔ میں غریب مفلس کہاں سے پانچ ہزار

لاؤں"۔

ارم ماں کے پہلو میں بیٹھی رو رہی تھی ۔میرا دل پسیج گیا۔میں نے کہا۔

''میں میڈم سے بات کروں گا۔"

میں مشکل سے دو تین قدم آگے بڑھ چکا تھا کہ اُسنے آواز دی۔اس نے ارم کے دوپٹے کے سرے کو کھینچ لیا۔جسمیں گرہ پڑی تھی۔اور گرہ کھول کر اُسنے پانچ سو روپے نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔

''یہ بیٹے کی دوائی کے لئے رکھے تھے۔یہ بھی لے لیجئے۔"

میرے دل میں کھلبلی مچ گئی۔میں نے کہا۔

"آپ میرے ساتھ چلئے۔میں میڈم سے بات کروں گا۔"

حالانکہ میں جانتا تھا کہ میڈم جب اڑ جاتی ہے تو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی ہے میں نے سوچا کہ کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے۔اور کچھ اطمینان بھی تھا کہ وہ میری بات رکھ لے گی۔

میں نے میڈم سے سرگوشی میں کہا۔"

''پندرہ سو دے رہی ہے۔لے لو۔معاملے کو طول مت دو"۔

وہ گھُور گھُور دیکھ کر بولی۔

"تم ڈرپوک ہو۔جاؤ،شاعری کرو۔"

وہ مداخلت پسند نہیں کرتی تھی۔اس لئے آفس میں وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی کی پگڑی اترتی ہی رہتی۔

میں نے سوچا۔

'' قلمکار حساس طبیعت کے ہوتے ہیں۔معمولی چوں وچرا بھی گوارا نہیں کرتے۔''

میں نے مفر ہی مناسب سمجھا۔ اسی اثنا میں نجمہ بی میڈم سے بولی۔

''میں غریب ہوں۔ یہ پندرہ سو روپے لے لو۔ اور مجھے مارکس سٹرفکیٹ دیدو۔"

میڈم نے ایک نہ سنی۔ آن کی آن میں دونوں بھڑک اُٹھیں۔ اور نجمہ بی پہاڑی زبان میں کوئی ناشائستہ لفظ کہہ بیٹھی۔ میڈم سیخ پا ہوگئی۔

"دُور ہو جاؤ میری نظروں سے"۔ اُسنے چپراسی کو بُلا کر کہا۔

''اس کم ذات کو نکال باہر کرو۔"

میں مارکس سرٹیفکیٹ لئے بغیر نہیں ہٹوں گی۔ مارکس سٹرفکیٹ دیدو۔ نہیں تو"

''نہیں تو کیا"۔

نہیں تو لینے کے دینے پڑیں گے"۔

''پھر۔۔۔پھر"

میڈم طیش میں آکر بے قابو سی ہوگئی۔

اس بیچ سارے سٹاف ممبر جمع ہو گئے۔ ایسا گمان ہوتا تھا کہ مداری کا کھیل چل رہا ہے۔ آفس میں شوروغل مچ گیا۔ نجمہ بی مُڑ مُڑ کر چلا رہی تھی۔

''مارکس سٹرفکیٹ دیدو۔ نہیں تو پچھتاؤ گی"۔

''ارے جا جا۔ بڑی آئی۔ بڑی ناک والی"۔ میڈم بولی۔

''ہم غریب ہی سہی، لیکن ہماری بھی عزت ہے۔ آپ کو خمیازہ بھگتنا پڑے گا"۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ کچھ سٹاف ممبر میڈم کو مشورہ دیتے رہے لیکن سب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ میں اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ کچھ دیر بعد میڈم کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے کہا۔

''میڈم۔ بار بار اس عورت سے الجھنا ٹھیک نہیں ہے۔ اپنے رتبے کا کچھ خیال کریں"۔

’’آپ بجا کہہ رہے ہیں۔لیکن ادارے کا نقصان ہو۔ یہ میں قطعاً برداشت نہیں کرسکتی۔‘‘

’’پانچ ہزار بھرنا ہی بھرنا ہے۔" وہ بولی۔

نجمہ بی بہت تنگ آگئی تھی۔ کہتے ہیں تنگ آمد بہ جنگ آمد۔ بات طول پکڑ رہی تھی۔عورت ذات، دونوں اڑ گئیں۔مسئلہ کورٹ کچہری تک پہنچ گیا۔

اُس روز ہم آفس میں محو گفتگو تھے۔کہ فون کی گھنٹی بجی۔میڈم گھبرا سی گئی۔اُسکے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔فون پر کوئی بول رہا تھا

’’میڈم، آپ کو آج کورٹ میں حاضر ہونا ہے"۔

میڈم پر اضطراری کیفیت چھا گئی۔ یہ وکیل کا فون تھا جو کورٹ میں کیس لڑ رہا تھا ٹیبل پر پڑے کاغذات سمیٹ کر الماری میں پھینک دیئے۔ارم کی فائیل کے تمام دستاویزات ساتھ رکھوا دیئے اور پانچ قابل سٹاف ممبران کی جماعت لے کر کورٹ پہنچ گئی۔جونہی کیس کی شنوائی شروع ہوئی۔جج صاحب بولے۔

’’آپ ہی پرنسپل ہیں۔"

’’ہاں جی ۔ہاں جی" کہہ کر میڈم نے اعتراف کیا۔

’’آپ کے خلاف بے ضابطگی کا کیس دائر ہوا ہے۔آپ نے ارم نامی طالبہ کو ذہنی کوفت پہنچائی ہے۔اور اُسے مارکس سرٹیفکیٹ کے عوض پانچ ہزار روپے طلب کیے ہیں۔"جج صاحب نے تند لہجے میں کہا۔

میڈم نے ذرا سی اونچی آواز میں صفائی دیتے ہوئے جواب دیا۔

’’جناب، وہ جرمانہ ہوا ہے اور جرمانہ طالبہ کو ہی بھرنا ہے"۔

’’اپنی آواز دھیمی کرو۔" جج صاحب بولے۔

اور میڈم ایکدم چپ ہوگئی۔ پھر وکیلوں کی جرح ہوئی اور جرح کے بعد جج

صاحب نے فوری فیصلہ سنایا۔

''غلطی ادارے سے ہوئی ہے۔اس میں طالبہ کا کوئی قصور نہیں ہے۔اس لئے بلا تاخیر طالبہ کا مارکس سٹیفکیٹ اجرا کیا جائے۔اور کیس کی اگلی شنوائی کل ہوگی۔"

نجمہ بی مارکس سٹیفکیٹ لے کر چلی گئی۔اور ہم آفس میں بیٹھے کیس کی باریکیوں پر سوچ رہے تھے۔کہ اسی اثنا میں ایک آدمی وکیل صاحب کا بل دیکر چلا گیا۔

''تیرہ ہزار" دیکھکر میڈم چونک گئی۔

''پانچ ہزار سے زیادہ ایک کوڑی بھی نہیں دوں گی"۔

میں نے کہا۔

''میڈم آخر لینے کے دینے پڑ ہی گئے''

اور وہ زور زور سے ہنستی رہی۔

☆☆☆

بکھرتے خواب

آگ کی لپٹیں ایک ایک کر کے عمارتوں کو راکھ کے ڈھیر میں بدل رہی تھیں تو خاںؔ صاحب بے بسی کے عالم میں اپنی بربادی کا منظر دیکھ کر سر پکڑ بیٹھ گئے۔ ان گنت لوگ آگ بجھانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن آگ تھی بجھنے کا نام نہیں لے رہی تھی بے حواس ہو کر جب وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑے۔ تو مریمؔ جان سینہ پیٹتے دوڑ پڑی۔

''یا میرے مولا۔ یہ کیسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے"

اُس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔

''آنکھیں کھولیئے۔ دیکھئے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی پانیؔ لے آؤ۔"

پانی کے چند گھونٹ پی کر غشی کی حالت جاتی رہی۔ خاںؔ صاحب نے جب آنکھیں کھولیں آگ بُجھ چکی تھی۔ ہلکی سی ہوا سے راکھ اُڑ کر زمین پر بکھرنے لگتی ۔۔تو۔۔۔۔خاںؔ صاحب کو اپنی برسوں کی کمائی زمین میں دفن ہوتے نظر آنے لگتی۔ لوگ جا چکے تھے۔ خاںؔ صاحب کے چہرے پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی اور آگ کی غیر معمولی تمازت سے شاید آنکھوں کے آنسو بھی سوکھ چکے تھے۔ اور ان میں بڑی بڑی سُرخ لکیریں اُبھر آئی تھیں مریمؔ جان اپنے شوہر کو حوصلہ دیتی رہی۔

''آپ گھبرائیے مت۔ ہمت اور حوصلے سے کام لیجئے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

''کیا خاک ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ تو جل کر راکھ ہو چکا ہے۔"

خان صاحب کو غصہ آیا۔ پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ چیخنے چلانے لگے اور ان کی چیخیں فضا کی وسعتوں میں گونجنے لگیں۔ وہ پاگلوں کی طرح اُچھلتے کودتے رہے اور زمین پر پاؤں مار مار کر قدرت کے تئیں ناراضگی کا اظہار کرتے رہے۔ مریم جان خان صاحب کے شانے تھپتھپاتی رہی۔ تو وہ تھرتھراتے بول پڑے۔

''مریم سب کچھ لُٹ چکا ہے۔ سب برباد ہو گیا ہے۔ قدرت نے ہم پر کیوں یہ غضب ڈھایا ہے؟ کیوں پلک جھپک میں ہمیں محتاج بنا دیا؟''

قدرت کی مرضی کے سامنے انسان ہمیشہ بے بس ہوتا ہے۔ وہ سینہ پیٹتے ہوئے چلے گئے۔

خان صاحب ایک کاروباری تھے۔ اور بڑے بڑے کارخانے کھول رکھے تھے۔ وہ دولت۔ بس دولت کمانا چاہتے تھے تاکہ اہل وعیال کو ہر طرح کی آسائش میسر رکھ سکیں۔ بڑے بڑے خواب آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دِلا کر بڑے بڑے عہدوں پر فائز دیکھنا اُن کا مقصدِ حیات بن چکا تھا۔

لیکن پدرانہ شفقت کے سایے کی پرتوں کو سناٹے کا مینہ ریزہ ریزہ کر چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مقدر برگشتہ ہو گیا۔ تمام کارخانے آنکھ جھپک میں راکھ کے ڈھیر میں بدل گئے اور خان صاحب شاہ سے گدا بن گئے۔ کاتب تقدیر کی تحریر کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ خان صاحب پریشان، مغموم سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ مریم جان بول پڑی۔

''دیکھئے۔ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے بہتر ہے آپ کوئی کام دھندا شروع کریں۔"

''کیا کروں۔ زمین سخت ہے۔ آسمان دُور ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔"

"ہانڈی پکنا مشکل لگ رہا ہے۔ کچھ تو کیجئے۔"

بات آگے بڑھاتے ہوئے مریم جان بولی۔

"آخر ہمارے بچوں کے کیریئر کا سوال ہے۔"

خان صاحب طیش میں آکر بولے۔

"ہاں بھئی۔ بڑے بیٹے کو ایل ایل بی کرا کے ایک بڑا وکیل بننا ہے۔ پھر۔۔۔وہ۔۔ضرور کسی سیاسی جماعت سے وابسطہ ہو جائے گا اور۔۔۔۔ پھر۔۔۔ وہ ضرور منسٹر بن جائے گا۔ خوب نام ہوگا چرچے ہونگے۔ وہ دیکھو خان صاحب کا منسٹر بیٹا۔ مقررانہ انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔

"بلقیس۔۔۔۔ وہ تو ضرور ڈاکٹر بنے گی۔ اپنا پرائیوٹ کلینک کھول کر خدمت خلق کرے گی۔ درد کا علاج کرے گی۔ مریضوں کو صحت یاب کرے گی۔ اور لوگ خوب دعائیں دیں گے۔۔۔۔۔ اب رہی بات کامران کی تو خان صاحب کا اتنا بڑا کاروبار سنبھالنے والا تو کوئی ہونا چاہیے وہ کاروبار سنبھالے گا۔ خوب منافع کمائے گا۔ نوکر چاکر ہونگے۔ اور لوگ اُس کو دیکھ کر کہیں گے۔ وہ دیکھو۔۔۔ خان صاحب کا انڈسٹریلسٹ"۔

"دیکھئے۔ آپ ہمت رکھئے۔ اور خدا کا نام لیکر کام شروع کیجئے۔ ہمارے بچے ضرور وہی بنیں گے۔ جو آپ سوچ رہے ہیں۔"

خان صاحب کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنا شروع ہوئے اور نم دیدہ اپنی شریک حیات کو تکتے رہے۔ اپنی ڈوبتی نیا کو کنارے لگانے کے تمام راستے بظاہر مسدود نظر آتے دکھائی دے رہے تھے۔

خان صاحب کی اپنے علاقے میں الگ جاہ و منزلت تھی۔ بڑے ٹھاٹ باٹ سے زندگی جی رہے تھے۔ تبھی تو۔۔۔۔ منسٹر صاحب بھی گھر تشریف لے آئے تھے۔

''بڑا دکھ ہوا سنکر۔ آپکے کارخانے آگ کی نذر ہوئے ہیں۔"

''جناب قدرت کی مرضی کے سامنے انسان بے بس ہے۔"

ہاں بھئی۔ انسان تو بے بس ہے۔ اور ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ نقصان تو ہوا ہے۔

''جناب اللہ کی مرضی۔ نقصان تو ہوا ہے۔ لیکن۔۔۔ آپ کا ہاتھ سر پر رہے تو دن بدل جائیں گے۔''

اظہار ہمدردی جتا کر منسٹر صاحب وداع ہوئے، تو خان صاحب سے بولے۔

''آپ فکر مت کیجئے۔ میں حکومت کی طرف سے امداد ضرور دلوادوں گا۔ اور کام پھر شروع کیجئے آخر آپ نے الیکشن جتانے کے لئے بہت داؤ پیچ کھیلے ہیں۔ ہم بھولے نہیں ہیں"۔

منسٹر صاحب چلے گئے۔ تو۔۔۔ مریم جان بغل میں آکر بیٹھ گئی۔ بہت متفکر لگ رہی تھی۔ چہرے سے خزاں کے سوکھے پتوں کی سی زردی جھلک رہی تھی۔ کہاں وہ ناز و ادا اور کہاں وہ خراماں خراماں چلنا۔ صورت بگڑی بگڑی سی اور سہمے سہمے بول پڑی۔

''دیکھئے۔ بلقیس کو داخلہ فیس جمع کرانی ہے۔ تبھی تو تعلیم جاری رکھ سکے گی۔''

پھر کامران اور بڑے بیٹے کا ذکر بھی چھیڑ دیا۔'

''ان کو بھی داخلہ لینا ہے۔ روپے کی ضرورت پڑھ جائے گی۔ کوئی انتظام کیجئے۔ بچوں کے مستقبل کا سوال ہے۔"

خفیف سی خاموشی کے بعد مریم جان پھر بول پڑی۔

''اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے مسئلے حل نہیں ہو جاتے۔ خدا کا نام لیکر کوئی کام دھندا شروع کیجئے۔ یہ مشکل وقت ٹل جائے گا۔ خدا پر بھروسہ رکھئے۔"

''ہاں مریم کام تو کرنا پڑے گا۔"

وہ مریم جان کے مایوس چہرے پر پھر وہی مسکراہٹ دیکھنا چاہتے تھے۔ اُس سے کھل کِھلا کر ہنستے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ کچھ دیر پیار سے بیوی کے شانے تھپتھپاتے رہے۔

خاںؔ صاحب مصیبت کے دن کاٹ رہے تھے۔ پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اوران کے بچے بھی اب گھر میں کم کم نظر آ رہے تھے۔ خاںؔ صاحب کو فکر تھی۔ تو بس بچوں کے مستقبل کی۔ وہ اس وقت سخت اچنبھے میں پڑ گئے جب تمام بزنس پارٹنرز حویلی میں آ دھمکے۔ اور ہنگامہ بپا کیا۔

''ہمارا روپیہ واپس کیجئے۔'' وہ بار بار چلاتے رہے۔''

خاںؔ صاحب یخ کی مانند سرد پڑھ گئے اوران کی سوچنے کی صلاحیتیں جیسے منجمد ہوگئیں۔ کہیں تو کیا کہیں۔ اب اُنکے پاس صرف ایک حویلی بچی تھی۔

''آپ اطمینان رکھئے۔ آپکی پائی پائی چکادی جائے گی"۔ مریم جاںؔ بول پڑی۔

''خاںؔ صاحب حساب بے باق کر دیجئے۔ ہم دس دن کی مہلت دے دیتے ہیں۔ ورنہ راستے اور بھی ہیں'' یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

مریم جاںؔ اضطراری کیفیت میں آنگن میں گھوم رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد بول پڑی۔

''آپ کچھ کرتے کیوں نہیں۔ مجھ سے سہا نہیں جاتا۔ میں خودکشی کرلوں گی"

''توبہ۔۔۔۔توبہ بیگم۔۔۔۔۔ایسا کُفر مت بولئے۔

وقت کے تھپیڑوں نے خاںؔ صاحب کی سُدھ بُدھ پر منفی اثر ثبت کرنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ بے جان بُت لگ رہے تھے اور ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ چارپائی پر لیٹے

مریمؔ جان کو بے بس تک رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ مریم جانؔ فون اٹینڈ کرتے ہی زمین پر پاؤں پسارنے اور لباس تار تار کرنے لگی۔ اُس نے بری خبر سنی۔

''آپ کے بیٹے کو منشیات کا دھندا کرتے پولیس نے رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا ہے۔ اُس پر جیسے بجلی ٹوٹ پڑی۔ وہ پاگلوں کی طرح خان صاحب کی طرف دوڑ پڑی۔

''اُٹھیے۔۔۔اُٹھیے۔ ہمارے بیٹے کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔ خان صاحب پریشان اُٹھ کھڑا ہو گئے اور منسٹر صاحب کو فون ملانے لگے۔

''فون لگتا نہیں ہے۔ کیا کریں۔"

خانؔ صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ منسٹر صاحب کے کواٹر کی طرف چل پڑے۔ ملاقات تو ہوئی۔ لیکن۔۔۔ نامرادی حصے میں آئی۔ وہ دل برداشتہ ہو کر واپس لوٹے۔ وہ خود کو بے سروسامان سپاہی کی طرح محسوس کرنے لگے۔ جیسے پرندوں کے جُھنڈ میں کوئی بے پَر پرندہ۔ جو اُڑان بھر نہیں سکتا۔ وہ آنگن میں داخل ہوئے تو مریمؔ جان دوڑ پڑی۔

''کہاں ہے میرا بیٹا۔ اُس کو چھڑا کر لائے کیا؟ کیا بولے منسٹر صاحب؟"

''مریمؔ۔ تمام دروازے مقفل ہو چکے ہیں۔''

''نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ نے منسٹر صاحب کی خاطر راتوں کی نیندیں حرام کردی ہیں۔ اور اُن کو جیت دِلانے کے لئے کیا کیا نہیں کیا ہے۔ وہ کیسے بھول گئے۔"

خانؔ صاحب کے بیٹے کے خلاف عدالت میں کیس دائر ہوا اور عدالتی فیصلے میں سزا ہوئی۔ وہ ٹوٹ گئے۔ میاں بیوی منسٹر صاحب کے رویے پر سوچ رہے تھے کہ کامرانؔ آکر غصے میں بولا۔

''ڈیڈی آپ ایک ناکام انسان ہیں۔آپ نے ہمارا جینا دُوبھر کیا ہے۔یہاں ہمارا دم گھٹ رہا ہے۔خدا حافظ۔"

کامران گھر سے چلا گیا اور دنیا کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں گُم ہو کے رہ گیا۔ایک بعد ایک مصیبت خانؔ صاحب کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

مریؔم جان اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر بولی۔

''ہم سے کیا خطا ہوئی ہے جو یہ مصیبت بھرے دن دیکھنے پڑتے ہیں۔گھر کا شیرازہ بکھرتے دیکھ دونوں پریشان لگ رہے تھے۔

"خطا۔۔۔۔خطا تو ہوئی ہے مریؔم۔بہت بڑی خطا۔میں بچوں کو بڑے رتبوں پر فائز دیکھنا چاہتا تھا اسی چکر میں میں غیر قانونی دھندے کرتا رہا ۔اور دولت کی خاطر میں غلطی پہ غلطی کرتا رہا۔''

''کیا"

''ہاں مریؔم یہ سچ ہے۔"

''آپ ہمیں حرام کی کمائی سے کھلاتے پلاتے رہے آپ گنہ گار ہیں میں ایک پل کے لئے یہاں ٹھہر نہیں سکتی۔خانؔ صاحب نے اُسکو روکنے کی بہت کوشش کی۔لیکن۔۔۔۔وہ بلقیس کو لے کر نکل گئی۔.....اور خواب بکھرتے گئے۔



منتظر آنکھیں

آسمان کے گھنے کالے بادل دن کی روشنی پر پہرے ڈالنے لگے تھے۔ دن میں رات کا سماں بندھنے لگا۔ تیز ہوا چلنے سے کسی بھیانک طوفان کا خدشہ ہونے لگا۔ گرد اُڑ اُڑ کر آسمان کی وسعتوں میں سلسلہ وار چھوٹے بڑے ٹیلے وجود میں لانے لگی اور وہ روشنی پہ کالی گرہیں لگنے لگے۔

سلیمان ہکلاتے دست بدعا ہوا۔

"یا میرے مولیٰ۔۔۔ اُس کی حفاظت۔۔۔ کرنا۔ وہ دل کی۔۔۔۔ بہت۔۔۔ کمزور ہے۔"

سلیمان بڑی پھرتی سے گھر کی طرف بھاگے جا رہا تھا۔ چہرے پر اُداسی تھی۔ بہت متفکر لگ رہا تھا۔

"مولیٰ۔۔۔ اُس کو۔۔۔۔ سلامت رکھنا۔ اپنے سایہ۔۔۔ عاطفت۔۔۔۔ میں رکھنا۔"

گرج چمک کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہونے لگی۔ تیز و تند ہوا سے درخت جڑوں سے اُکھڑنے لگے۔ وہ بہت گھبرا گیا۔ چیخنے چلانے لگا۔

"کوئی میری مدد کرو۔"

چاروں طرف آندھیرا ہونے لگا۔ پرندے ڈرے سہمے گھونسلوں میں پناہ لینے لگے۔ سلیمان کتوں کی ہڑبونگ سے بوکھلا گیا۔ وہ تسبیح سلیمانی ورد کرنے لگا۔۔۔ تو

۔۔۔۔بجلی کے کھمبوں پر اچانک قمقموں سے روشنی کی پو پھٹی۔۔شاید جگنوؤں کا دل پسیج گیا ہو۔اور قمقموں سے لپٹ گئے ہوں۔اس قیامت کی گھڑی میں کوئی مُحب بن کے تو آیا۔

راستے کی ناہمواریوں کی پرواہ کئے بغیر وہ گھر کی جانب بڑھ رہا تھا، ہر قدم کے ساتھ رفتار میں پھرتی آرہی تھی۔

''رخسار ہمت رکھنا، حوصلہ رکھنا'' وہ بڑبڑاتا رہا۔''

فلک کی نیت سے طوفانی خدشے برابر جھلک رہے تھے۔اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی وہ رخسارؔ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اُتاولا ہو رہا تھا۔بالآخر وہ گھر پہنچ ہی گیا۔رخسارؔ انتظار کرتے کرتے تھک چکی تھی۔

وہ بے پناہ محبت کرتی تھی اُسے۔وہ دہلیز اُلانگتی تو کبھی کمرے میں آویزن سلیمانؔ کی تصویر کو غور سے تکتی۔

سلیمانؔ پر نظریں پڑتے ہی اس کی جان میں جان آگئی۔اُس کی بانہیں بے صبر ہو رہی تھیں وہ سلیمانؔ کو باہوں میں لے کر پاگلوں کی طرح چومنے لگی۔جوان بانہوں میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا۔اس پر غشی طاری ہوئی۔۔۔تو۔سر رخسارؔ کے کندھوں پر آٹھہرا۔

رخسارؔ پریشان، گھبرائی سی۔سلیمانؔ کا گول گول چہرہ تھپتھپاتے بول پڑی۔

''آنکھیں کھولو سلیمانؔ۔تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔آخر بات کیا ہے۔''

ایک سانس میں کئی سوال کر بیٹھی

مگر وہ برابر غشی کی حالت میں رہا۔چہرہ مرجھایا ہوا۔آنکھیں نیم وا۔رخسارؔ نے اُس کو بیڈ روم میں بیڈ پر لٹا دیا۔کچن میں کونٹر سے پانی کا گلاس لے آئی اور سلیمانؔ کے چہرے پر پانی کے چھینٹیں دینے لگی۔۔وہ اضطراری حالت میں کمرے کے اندر

گھومنے لگی کہ سلیمان نے آنکھیں کھولیں۔

''رخسار۔۔۔۔رخسار۔" وہ بڑبڑانے لگا۔

وہ گھبرائی بستر پر جھپٹ پڑی۔ اور سلیمان کے ہاتھ ملنے لگی۔

''تم ٹھیک تو ہو"

سلیمان نے سر ہلاتے حامی بھرلی۔

''میں ڈاکٹر کو بُلالوں گی۔تم پریشان مت ہو۔"

رخسار ڈری سہمی بول پڑی۔

سلیمان ہوش میں آگیا۔اور ڈاکٹر کو بُلانے سے منع کیا۔تو۔رخسار کی پھولتی سانسیں دم لینے لگیں۔

''یا میرے مولا۔ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔سلیمان کو ہمیشہ اپنی امان میں رکھنا"۔

اور اس سے پوچھ بیٹھی۔

''اب کیسا محسوس ہورہا ہے۔"

''میں ٹھیک ہوں۔اس نے کہا۔

سلیمان فق پڑ گیا تھا۔اور پژمردگی نے چہرے کی رونق پر جیسے ڈاکہ ڈال دیا ہو۔ رخسار کچن سے گرم گرم دودھ اور کھانا لے آئی۔سلیمان کو کھلایا پلایا۔خوب خاطر تواضع کی۔اور اطمینان سے اُسکے پاس بیٹھ گئی۔

سلیمان نے پوچھا۔''تم اسپتال سے کب لوٹی۔"

'' تب موسم ٹھیک تھا"۔

''ڈاکٹر صاحب ملے؟''

''ہاں۔کچھ دوائیاں تجویز کی ہیں۔اور کچھ ٹسٹ بھی کراونے ہیں۔"

رات گزر گئی۔تو اگلی صبح رخسار ٹسٹ کرانے اسپتال چلی گئی۔وہ سیڑھیاں چڑھنے

لگی تھی کہ اُس کی نظریں اسپتال کے احاطے میں داخل ہوتی ایک چمچماتی کار پر پڑیں۔ وہ ایک دم رُک گئی اور سانس پھیپڑوں کی نالی میں اٹکنے لگی۔ قدیرؔ صاحب کار سے اُترتے ہی ڈاکٹروں کے کیبن کی طرف چل پڑے۔ وہ کیبن میں داخل ہو گئے تو رخسارؔ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اور ماضی کی اُن حسین یادوں میں کھو گئی جب وہ قدیرؔ صاحب کے پہلو بہ پہلو چلا کرتی تھی۔ اور۔۔۔ پھر۔ کڑواہٹ کے وہ پل بھی یاد کرنے لگی۔ جب قدیرؔ صاحب اُسے آڑے ہاتھوں لیتے اور بات بات پر منحوس کہتے۔

قدیرؔ صاحب اب شہر کے گنے چنے روءسا میں شمار ہونے لگے تھے۔ وہ بڑے بڑے کارخانوں کے مالک بن چکے تھے۔ اور مصنوعات کے درآمد برآمد میں بہت مشغول رہتے تھے۔ وہ دولت کمانے میں ہمہ تن جُٹ گئے۔ وہ دنیاوی جاہ و حشمت کے تعاقب میں رخسارؔ کو دل کے تہ خانوں میں دفن کر چکے تھے۔ اور اُسے اندھیروں میں چھوڑ کر بہت دُور نکل پڑے تھے۔ وہ تمام رؤسا پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ اُن پر دولت۔۔۔۔۔ بس دولت کمانے کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ جس سے دونوں میں دُوریاں قائم ہوئیں۔

قدیرؔ صاحب کیبن سے نکل رہے تھے تو رخسارؔ کی نظروں پر دُھندلاہٹ سی چھا گئی اور وہ اوجھل ہو گئے۔ رخسارؔ ڈاکٹر کے پاس جانچ رپورٹ لے کر چلی گئی تو پتہ چلا کہ اُسے سل کی بیماری ہو گئی ہے۔

وہ گھر لوٹ گئی۔ سلیمانؔ گھر میں موجود تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ کمرے میں چلے گئے۔ رخسارؔ کے چہرے پر مایوسی دیکھکر وہ گھبرا گیا۔ اُس نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

''رخسارؔ۔ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ وہ خاموش رہی۔

"ڈاکٹر کیا بولے"

اُس کے لبوں پر سکوت برابر رہا۔

''مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ایک پیالی چائے تو پلاؤ۔"

وہ چائے لے آئی۔اُس کے چہرے سے مایوسی کے بادل چھٹتے دیکھ سلیمان بول پڑا۔

''بھول جاؤ اُسے۔اُس نے درد و غم کے سوا دیا ہی کیا تم کو۔آخر تم تو انسان ہو۔ کب تک سہتی رہو گی۔"

رخسار کے دل و دماغ میں ہلچل مچ گئی۔وہ کمرے میں آویزاں قدیر صاحب کی تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگی اور من ہی من سوچنے لگی

''میں نے بُرے دنوں میں اُس کا ساتھ دیا ہے۔طرح طرح کی مصیبتیں جھیلی ہیں۔پھر۔۔۔۔اتنی بے مروتی کیوں؟اتنی بے رُخی کیوں؟

رخسار کی ہر کھٹی میٹھی یاد قدیر صاحب سے جُڑی تھی۔عرصہ بیت گیا جب وہ رخسار کو بے آسرا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ایک نئی دنیا میں۔جہاں فرصت نہیں۔الفت نہیں۔ سکون نہیں۔سب پہ ایک ہی دُھن سوار۔

''سب سے بڑا روپیہ"

قدیر صاحب کی بے رخی رخسار کو ایک کالے ناگ کی طرح ڈس رہی تھی اور وہ چُپ کاٹ برداشت کرتی رہی۔روز مضمحل ہوتی جارہی تھی۔شاید ایام اسود زندگی کی دہلیز پر دستک دے چکے تھے۔سلیمان نے اس خاموش ماحول میں رنگ بھرنے کی کوشش کی۔

''میں سوچ رہا ہوں۔کسی صحت افزا مقام کی سیر کی جائے۔تمہارا دل بھی بہل جائے گا اور۔۔۔۔میں بھی خوش"۔

''ہاں بھئی۔سوچنے میں کیا ہے"وہ بولی۔

''رخسار میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تم میری کائنات ہو۔ ان اندھیروں سے نکل آؤ۔ ہر رات کے بعد ایک نئی صبح ہوتی ہے۔ تم زندگی کی نئی شروعات کرو۔"

وہ رخسار سے ٹیک لگائے بول پڑا۔

رخسار اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اپنی محبت کا اظہار کرتی رہی۔ وہ جان چھڑکتی تھی اُس پر۔ سلیمان بے تکلفی برتتے بول پڑا۔

''رخسار تم اپنے دل کے آئینے سے اُس کی تصویر مٹا دو۔"

رخسار کی بیماری دن بدن بڑھنے لگی۔ اور پھیپھڑوں کے زخموں سے خون فواروں کی طرح پھوٹنے لگا۔ وہ بہت زیادہ درد محسوس کر رہی تھی۔ لیکن یہ بات سلیمان پر ظاہر نہیں کی کہ وہ زندگی کے آخری ایام کاٹ رہی ہے وہ اُس کو ہشاش بشاش دیکھنا چاہتی تھی۔

مخاطب ہو کر بولی۔

''سلیماں۔ یہ آج تم پاگلوں جیسی باتیں کیوں کرتے ہو۔"

''رخسار میں تم کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔''

رخسار زندگی کی حقیقت سے کیسے فرار اختیار کرتی وہ بیماری سے نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔

کہ طوفانی ہواؤں نے پھر دن ڈھلتے کھڑکیوں پر دستک دی۔ اور زور کی بارش آنے لگی۔ سلیمان نے کھڑکیاں کواڑ بند کر دیئے۔

بلبل رونی صورتیں بنائے قریب پھڑ پھڑا رہے تھے۔ شاید۔ رخسار کی مرجھائی صورت دیکھ کر مغموم ہو رہے تھے۔ جو روز انھیں دانہ کھلاتی تھی۔

رخسار کا بدن آج غیر معمولی بخار سے تپ رہا تھا۔ وہ بستر پر لیٹتے سلیمان سے

مخاطب ہوئی۔

''میرے پاس آ کر بیٹھو۔"

اور پیار سے اُسکو سہلاتی رہی۔ اور اپنی غیر معمولی محبت کا اظہار کرتی رہی۔ وہ بے قراری محسوس کر رہی تھی۔

تو سلیمان اُس کے پاؤں کے تلوے ہاتھوں سے رگڑنے لگا۔

'' میں ڈاکٹر کو لے آؤں گا۔ رخسار" رخسار کو رخسار نام سے پکارنا سلیماں کو اچھا لگتا تھا۔ اب اندھیرے چھانے لگے تھے۔ اور ۔۔۔۔۔۔۔قدیر صاحب بھی اب بھاگم بھاگ کی زندگی سے تنگ آ چکے تھے۔ شاید سمجھ چکے تھے کہ دولت ڈھلتی چھاؤں ہے۔ اور۔۔۔ شاید۔ اپنی غلطیوں کا احساس بھی ہو چکا تھا۔ ان طوفانی ہواؤں میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر رخسار کی طرف کھینچے چلے آ رہے تھے۔ دل میں محبت بھرے جذبات انگڑائیاں لینے لگے تھے۔

اب رات بہت سیاہ ہو چکی تھی۔ رخسار بستر پر خون کی قے کر رہی تھی۔ دروازے پر ٹکٹکی باندھے اب بھی آس لگائے بیٹھی تھی کہ دروازہ کُھلا۔ وہاں موجود سلیمان نے دل جھنجھوڑ دینے والی آواز دی۔

'' تم نے بہت دیر کر دی ۔ پا۔۔۔ پا۔ منتظر آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

وہ میڈم

سکول کا درجہ بڑھا دیا گیا تھا سکول عملے کے ردو بدل کے نتیجے میں کچھ نئے ملازم کام پر آ گئے۔ جن میں سکول کی سربراہ میڈم بھی تھی جو نئی پرنسپل بن گئی تھی شکل وصورت سے ماڈرن لگ رہی تھی۔ سرمائی چھٹیاں ہونے کی وجہ سے سکول بند تھا اس لئے میڈم کی شان میں کوئی استقبالیہ پروگرام منعقد نہیں ہوا۔ میڈم جسیم تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ کھانے پینے کی دلدادہ ہوگی۔ جبھی تو وہ بے تابی سے سکول کھلنے کا انتظار کر رہی تھی کیوں نہ کرتی۔ کشمیری پکوان دنیا بھر میں اپنے ذائقہ کے لئے جو مشہور ہیں۔ 'رستہ' 'گشتابہ' 'کباب' تقریباً ہر پارٹی میں پکائے جاتے ہیں۔ سرمائی چھٹیاں ختم ہوگئیں تو میڈم سج دھج کے سکول میں داخل ہوئی وہ اپنے ماتحت ملازموں سے ملنے کے لئے بے قرار تھی ایک چھوٹی سی تقریر بھی تیار کر کے لائی تھی جو اپنے ماتحت ملازموں کو گوش گزار کرنا چاہتی تھی میڈم خوش وخرم تھی ملازم آتے ہی اپنے اپنے کام پر لگ گئے جو میڈم کو بہت ناگوار گزرا۔ ملازموں کی عدم توجہی پر وہ بوکھلاسی گئی اور ایک چپراسی کو ساتھ لیکر سکول کا سارا احاطہ دیکھ آئی۔ چپراسی نے اُسے سکول اور سکولی عملے کے بارے میں ساری جانکاری دی۔ جبھی سے دونوں کے سمبندھ مضبوط ہو گئے۔ اور سکول کے ہر معاملے میں اُسے مشورہ لیتی۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد ملازم میڈم کے آفس میں جمع ہو گئے۔ اور اس سے تعارف کر کے کچھ تناول کرنے چلے اور کچھ نے مسجد کی راہ لی۔ اس روز بھی سکول میں کسی استقبالیہ پارٹی کا انتظام نہیں ہوا میڈم کے

دل کو بہت ٹھیس لگی۔ کشمیری میں مشہور ہے کہ 'یڈ کینہ گوء بُڑ کینہ'۔ وہ آفس کلرک پر برس پڑی۔

''یہ سکول کی مُہر میرے حوالے کر دو''

اور اُس نے مُہر چھین کر اپنی تحویل میں لے لی۔ جس پر کلرک نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ آفس کی چابیاں ہیں یہ بھی اپنے پاس رکھ لیجئے''

میڈم نے اُس کی نارضگی بھانپتے ہوئے کہا۔

''میں چند دنوں کے بعد مُہر واپس کر دوں گی''۔

''یس میڈم''

یہ الفاظ کلرک کے منہ سے کیا نکلے۔ دل و دماغ پر جیسے ثبت ہو گئے اب سکول میں، گھر میں، راہ چلتے یہ الفاظ اس کی زبان سے سننے جاتے۔ میڈم کی بات بات پر ایک ایک اشارے پر''یس میڈم'' کہنا اس کا تکیہ کلام بن گیا تھا۔ میڈم کی رائے کلرک طبقے کے بارے میں کچھ اچھی نہیں تھی وہ سب کو ایک ہی ترازو میں تولتی تھی۔ سب کے سب بے ایمان۔ سب اپنا اُلو سیدھا کرنے کی تاک میں رہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ دفتری کاغذات رکے پڑے تھے اور ملازموں کی پریشانیاں بھی بڑھ گئی تھیں جن کے آثار کلرک کے چہرے سے خاصکر جھلک رہے تھے تبھی تو اس کی نجی زندگی پر بھی اس ماحول کے منفی اثرات نمایاں ہونے لگے۔ اور گھر میں موجود ہو کے بھی وہ ہوش وحواس میں نہیں ہوتا۔ بیٹیاں اکثر و بیشتر بستہ کھولتے ہی لڑنا جھگڑنا شروع کرتیں ایک کہتی

''قمرین۔۔ٹمرین'' دوسری کہتی''انیقہ۔۔ٹنیقہ''

وہ خوب غصہ کرتیں خوب ایک دوسرے کو چڑاتی پھر کس کس کے بالوں کو پکڑ لیتیں کھینچا تانی میں مار پیٹ کرتیں پھر دونوں زور زور سے سسکیاں لے لے کر رونے

لگتیں۔ کبھی ممی، کبھی پاپا پکارتی یہ دیکھ کر مہروز دروازے کو دو دو ہاتھوں سے مارتی اور ممی ممی پکارتی یا سر پکڑ کے رہ جاتی۔ یہ سوچ کر کہ ممی ابھی آئے گی۔ دونوں ایک دوسرے پر نظریں دوڑاتیں۔

''او۔۔میری انیقہ''''او۔۔میری قمرین''

پھر دونوں گلے لگ کر ایک دوسرے کے آنسو پونچھ لیتیں

ایسے ہی ایک لمحے پہ ان کی ممی کمرے میں آ کر ان سے مخاطب ہوئی۔ 'قمرین 'انیقہ ہمیشہ لڑتی رہتی ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اپنی پڑھائی میں دھیان دو''

کمرے میں براجمان ان کے شوہر چونک کر بولے۔'

'یس میڈم''

''اوہو۔ حضور چپ چاپ بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں نہ بچوں کی فکر، نہ گھر کا خیال ۔جب دیکھو سکول کی پریشانیاں۔ آج یہ ہوا۔ آج وہ ہوا۔ ارے میں کہتی ہوں آپ اپنا تبادلہ کیوں نہیں کرواتے۔ آپ کا سکول میرے لئے مصیبت بن گیا ہے۔ پڑھے لکھے ہو کر بھی آپ سے اتنا نہیں بن پڑتا کہ اپنے بچوں کی طرف تھوڑا دھیان دیتے اور کچھ دیر کے لئے ان کو پڑھا لیتے۔''

اس پر ان کے شوہر نے کہا۔

''تم بھی تو پڑھی لکھی ہو۔ تم پڑھا لو۔''

''ارے میرے پاس کام کا انبار پڑا ہے۔ میں کون کون سا کام کروں گی۔ جھاڑو دوں کہ کھانا پکاؤں پھولوں کی آبیاری کروں کہ بچوں کو سکول کے لئے تیار کروں۔ کیا کیا کروں میں۔ میں تنگ آ گئی ہوں۔ اور غصہ کر کے وہ کمرے سے جانے لگتی کہ اُسی لمحے نینا آ کر بولی۔

انکل فون ہے۔'

''یس میڈم''

''او ہو۔ یہ میڈم نہیں ۔ نینا ہے نینا۔ جائیے فون لیجئے۔ ضرور میڈم کا ہی ہوگا جو آپ کو خوب نچاتی رہتی ہے میں پوچھی ہوں آپ کو اپنی عزت کا کچھ خیال ہے بھی۔ ماتحتی کرنا کوئی آپ سے سیکھے۔ آپ نے میری زندگی عذاب بنا کے رکھ دی ہے''

اور ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی ۔

''یہ میڈم ہمیشہ آپ کو پریشان کرتی ہے۔ میری مانو۔ کسی دوسرے سکول میں مبدل ہو جاؤ''

پھر وہ فون اٹینڈ کر کے آیا۔ شوہر کو پریشان دیکھ کر بیوی نے پوچھا۔

''کیا بات ہے''

وہ بھاگتے بھاگتے دبی زبان میں بولا۔

''میڈم کل سکول میں اپنا دوپٹہ بھول گئی ہے میں ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔''

''او حضور ۔ آج چھٹی ہے سکول بند ہوگا''

اتنے میں وہ سکول کی جانب دوڑ پڑا۔ سکول کے گردونواح کے دکاندار بھی حیران ہوئے اور طنزیہ انداز میں ایک نے پوچھا۔

''کیوں بھئی۔ اتوار کی چھٹی کی منسوخی کا اعلان کب سے ہوا ہے۔''

وہ اپنی رُوداد کس کس کو سناتا۔ وہ ہمیشہ ہی میڈم کے رویے سے پریشان رہتا۔ سکول کے تمام ملازم چار بجتے ہی گھروں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ مگر وہ تب تک وہاں سے نہیں جاتا جب تک میڈم گھر کی طرف روانہ نہ ہو جاتی اب دیر سے گھر پہنچنا اُس کا معمول بن چکا تھا اور بیگم بھی اب دیر سے آنے کی وجہ نہیں پوچھتی۔

میڈم چونکہ نئی نئی آفیسر بن گئی تھی جبھی تو سکول کے معاملات نپٹانے کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ وہ عجب طبعیت کی تھی وہ کبھی بھی اپنے ماتحت تجربہ کار ملازموں سے مشورہ

لینے کی زحمت تک نہیں کرتی۔ بلکہ ان پر اپنا رعب جمانے کے لئے ایسے احکامات جاری کرتی کہ وہ آپسی انتشار کے شکار ہو جاتے۔ اور ان کی عمل آوری میں ذرا سی دیر پر وہ کہرام مچا دیتی۔ وہ ایک ایک پر برس پڑتی سارا اسکولی عملہ حواس باختہ ہو جاتا اور بسا اوقات عجیب وغریب حرکتیں دیکھنے کو ملتی تبھی تو میڈم کے آفس میں چیخنے چلانے' رونے دھونے' ہنسنے ہنسانے کا شور وغل رہتا۔ وہ دراصل ملازموں کو ٹولیوں میں بانٹ کر زیر کرنا چاہتی تھی

ایک روز لیکچرار میڈم کے ساتھ ایک چھوٹی سی بات پر الجھ گئی۔

میڈم۔ ''میں پوچھتی ہوں آپ نے میری غیر موجودگی میں بنا اجازت آفس مُہر کا استعمال کیوں کیا۔ آپ فون پر پوچھ سکتی تھی؟''

لیکچرار میڈم۔ ''میڈم میں نے جو کچھ کیا سکول کی بہبودی کے لئے کیا''۔

میڈم ''سکول کی بہبودی کے بارے میں سوچنا میری ذمہ داری ہے میں سکول کی سربراہ ہوں۔ مجھ سے پوچھے بغیر آپ نے سکول مہر کا استعمال آخر کیا کیوں؟

لیکچرار میڈم ''اچھا میڈم مجھ سے غلطی ہو گئی۔ معاف کیجئے''

میڈم ''مجھے تحریراً جواب چاہیئے''۔

لیکچرار میڈم نے جواب کیا لکھا۔ دن میں دو دو بار میڈم میٹنگ طلب کرنے لگی۔ کبھی کہتی۔ اس کا رلیونگ آڈر بنا کر لاو۔ کبھی کہتی۔ اس کا سروس بُک لاو۔ میں اُس پر اپنے ریمارکس لکھوں گی۔ بات زور پکڑتی گئی میڈم نے ضد نہ چھوڑی۔ لیکچرار میڈم نے وضع نہ بدلی۔ دونوں میں ایک جنگ سی شروع ہو گئی۔ اس جنگ کی لپیٹ میں آکر بہت سارے پس گئے۔ ایک اڈہاک میڈم نے لیکچرار میڈم کی طرفداری کیا کی۔ تو میڈم کی نظروں میں کھٹکنے لگی ایک دن میڈم نے رلیونگ آڈر بنوا کر اُس کو سونپ ہی دیا۔

''یہ کیا ہے میڈم'' اُس نے دبی زبان میں پوچھا۔

''خود ہی کھول کر دیکھو'' میڈم نے تیور بدلتے ہوئے کہا۔

اڈہاک میڈم نے ریلیونگ آڈر کیا دیکھا۔ وہ فرش پر پاؤں پسارے بیٹھ گئی اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

''میڈم مجھے معاف کردو''

اسکی آنکھوں سے جھرنے کی طرح آنسوں گرتے رہے اُس کو تڑپتے دیکھ کر آخر میڈم سے رہا نہ گیا۔ آڈر واپس لیکر پرس میں ڈال دیا۔ حالات کو دیکھ کر میڈم کی آنکھ بھر آئی۔ اور لیکچرار کی پیشانی تھپ تھپاتی رہی۔

میڈم کے سایہ عاطفت میں جگہ پانے والے ملازم ہمیشہ ہی ہشاش بشاش رہتے۔ اور خوب موج مستی کرتے رہتے۔ اپنی مرضی سے سکول میں جلوہ افروز ہوجاتے اور مرضی سے چلے جاتے سکول ان کے لئے جیسے کوئی تفریح گاہ تھا کس کی مجال کہ ان سے آنکھ ملا کر بات کرے۔ یہ میڈم کی نظر میں قابل اعتماد ملازم تھے تبھی تو میڈم ان کا اشارہ پاتے ہی حکم جاری کرتی۔ اور سکول میں کھلبلی سی مچ جاتی۔ ان ہی حالات میں لائبریرین کی میڈم سے تُو تُو میں میں ہوئی اُس نے خوب غصہ کیا۔ اور کچھ بدزیب الفاظ بھی اُس کی زبان سے نکلے۔ میڈم کو نا اہل اور نا قابل بھی کہا، اُس کی صلاحیتوں کو خوب ہدف تنقید بنایا۔ میڈم کی انا کو بہت ٹھیس لگی اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکتے رہے۔ لائبریرین اندر ہی اندر اپنے آپ کو کوستا رہا۔ اور میڈم کے سامنے معافی کی عرضی بھی دے ڈالی۔ مگر اُس روز وہ سکول میں آخری بار نظر آیا۔ علی صاحب نے جلے پر نمک چھڑکتے ہوئے میڈم کو کلرک کیخلاف جب اکسانے کی کوشش کی تو اُس کو یہ بات ناگوار گزری۔

میڈم ''آپ بار بار میرے معاملات میں مداخلت کرتے ہیں میں یہ برداشت

نہیں کروں گی۔

علی صاحب ''میڈم گستاخی معاف۔ میں آپ کو آگاہ کر رہا ہوں۔ کاغذ اچھی طرح دیکھ لیا کیجئے۔''

میڈم ''آپ میری قابلیت پر شک کرتے ہیں۔ یہ میری توہین ہے۔ اپنے آپ میں سدھار لاؤ۔ ورنہ۔۔۔!

علی صاحب سینئر سٹاف ممبر تھے انھیں میڈم کے رویے پر غصہ آیا اور شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

''ورنہ آپ کیا کروگی میڈم''

''آپ کو رلیو کروں گی''۔

علی صاحب ''یہ دھمکی مجھے مت دو۔ آپ کو میری رسائی کا اندازہ نہیں ہے۔ کل منسٹر صاحب فون پر ایک گھنٹہ میرے ساتھ بات کرتے رہے۔ میں آپ کو out کروادوں گا۔''

علی صاحب نے میڈم کو دانت کیا دکھائے۔ میڈم نے ایسا علاج کیا کہ سب کے سب نکال باہر کئے۔ اب ان کی بات مشکل سے ہی سمجھ میں آتی ہے۔ اس لئے ceo نے بھی آفس میں آنے سے منع کیا۔ اب وہ مجنون کی طرح ادھر اُدھر بھٹکتے نظر آرہے ہیں۔

میڈم آفیسر کیا بنی روز نئے نئے حیلے بہانے ڈھونڈ کر کسی نہ کسی کو اپنے عتاب کا نشانہ بنالیتی۔ ایک روز عارف صاحب نے دفتر میں میٹنگ کے دوران واک آوٹ کیا۔ تو میڈم کی نظروں میں کھٹکنے لگے۔ تب عارف صاحب نے اپنے دفاع میں سٹاف میٹنگ بلائی۔ جس میں تمام سٹاف نے شرکت کی۔ اور وہ مخاطب ہوکر بولے۔

''رفقائے کار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسلام علیکم!

آپ سبھی جانتے ہیں کہ یہ میٹنگ بُلانے کا ایک خاص مقصد ہے جب سے میڈم اس سکول میں تعینات ہوئی ہے ہمارے سارے کام چوپٹ پڑے ہیں۔کاغذوں پر دستخط نہیں ہورہے ہیں کسی کا time bond case رکا پڑا ہے تو کسی کی arrear bill نہیں نکلتی۔وقت پر تنخواہ نہیں نکلتی اب انتہا ہو چکی ہے ہم بال بچے والے ہیں۔اگر وقت پر تنخواہ نہیں ملی تو فاقہ کشی کی نوبت آئے گی۔ہمیں انصاف چاہیئے ۔بھائیو۔وقت کی ضرورت ہے کہ ہم سب ایک ہو جائیں اور اتحاد قائم رکھیں۔جو ہماری حفاظت کا ضامن ہے۔ورنہ۔۔۔لائبریرین اور علی صاحب کی مثال آپ کے سامنے ہے۔وسلام"۔ملازموں نے نعرے بلند کیئے۔

''عارف صاحب زندہ باد۔عارف صاحب زندہ باد''

اور وہ بہ اتفاق رائے سٹاف سیکریٹری منتخب ہوئے۔ملازموں کی یکجہتی دیکھ کر میڈم نے چپ سادھ لی اور عارف صاحب ریلیو ہوتے ہوتے بچ گئے سب نے اطمینان کی سانس لی

میڈم اب تھکاوٹ سی محسوس کر رہی تھی اُس نے کچھ دنوں کے لئے سکول سے رخصتی لینے کا فیصلہ لیا اور سکول کی ذمہ داری وائس پرنسپل کو سونپ دی جس نے تدریسی عمل کو فعال بنانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔سکول کے نظم ونسق میں بھی بہتری لائی اور بچے بھی پابندی کے ساتھ سکول آنے لگے۔لیکن ایک سٹاف ممبر کی بلا جواز غیر حاضری نے انھیں اُلجھن میں ڈال دیا مجبوراً وائس پرنسپل نے اس کے سیریل کے آگے سوالیہ نشان لگا دیا۔یہ ملازم تقریباً ایک ماہ سکول سے غیر حاضر رہا اور اس دوران دلی سے بھی گھوم آیا تھا۔کچھ دنوں کے بعد جب میڈم سکول آئی تو ملازم نے صفائی دیتے ہوئے چند آنسو بہالئے میڈم نے وائس پرنسپل کو بلا کر معاملے کو نپٹانے کیلئے کہا۔

''یہ چھوٹا ملازم ہے اس پر رحم کیجئے اور معاملہ رفع دفع کیجئے''۔

وائس پرنسپل ''میڈم یہ ڈیوٹی سے غیر حاضر رہا۔اور ہمیں اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی میں معذرت چاہتا ہوں۔

میڈم ''بچہ ہے۔ نادان ہے آئیندہ کوئی غلطی نہیں کرے گا اب کی بار اس کو معاف کر دیجئے''

وائس پرنسپل ''میڈم میرے اپنے کچھ اصول ہیں۔ یہ ڈیوٹی سے غیر حاضر تھا۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔

میڈم ''یہ میرا حکم ہے اور آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا''

وائس پرنسپل ''آپ مالک ہیں۔ آپکو جو کچھ کرنا ہے خود کیجئے میری نظر میں اس کی نوکری خطرے میں ہے۔''

پھر دونوں میں تیز کلامی ہوئی اور میڈم نے اونچے بولوں میں کہا۔

''آئیندہ میں کبھی آپ کو یہ ذمہ داری نہیں سونپوں گی۔ اور نہ ہی کبھی آپ سکول کے معاملات میں دخل دیں گے''۔

سکول کا تدریسی نظام روز کے انتشار سے بُری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ ملازم طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے تھے اور یہاں کے لوگوں کو بھی کوستے رہتے جنہیں اپنے بچوں کے مستقبل کا خیال نہیں۔ یہ سکول تماشا گاہ بن گیا تھا جہاں روز نئے نئے تماشے دیکھنے کو ملتے۔

ایک روز لوگوں کا ایک ہجوم سکول کے سامنے جمع ہوا اور سب شش و پنج میں لگ رہے تھے اندر میڈم اور بچوں کے درمیان جیسے جنگ چل رہی تھی میڈم بچوں کو مضمون بدلنے کے لئے مجبور کر رہی تھی اور انُھیں ہر مضمون کی اہمیت سمجھا رہی تھی مگر بچوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تنگ آ کر بھاگنے لگے یہ حرکت میڈم کو برداشت نہیں ہوئی۔ آپے سے باہر ہوگئی اور دیر تک بچوں کے ساتھ ہانکا ہانکی کرتی رہی۔ بچوں نے میڈم کی ایک

نہ سنی۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر بھاگتے رہے اس بیچ اُس کے خلاف نعرے بھی گونجتے رہے۔

''میڈم کو آوٹ کرو۔ میڈم کو آوٹ کرو۔''

سارا دن جیسے کبڈی کھیلی گئی یہ کوئی کھلاڑی آوٹ نہیں کرنا تھا یہ میڈم تھی جس نے گاؤں کے بڑے بزرگوں پر یہ کہہ کر رعب جمانا چاہا تھا کہ میں ڈپٹی کمشنر کے برابر ہوں جس پر یہ لوگ ہنستے رہے۔

ملازم تب اچنبھے میں پڑ گئے جب معلوم ہوا کہ میڈم نے کچھ بچوں کے ساتھ دوستی کرلی ہے اور اُنہیں جاسوسی کے کام پر مامور کیا ہے جو سکول کے حالات و واقعات پر نظر رکھ کر اُس کو اطلاع دیتے رہتے۔ ایک دن یہ بچے مارا ماری پر اُتر آئے۔ ایک بچے کو اتنا زدوکوب کیا کہ اسپتال میں بھرتی کروانا پڑا۔ ایک اُستاد نے اس کے علاج ومعالجے پر اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے ووچر میڈم کے حوالے کیے۔ ووچر میڈم کے پرس میں کیا گئے کہ اندر ہی اندر کاغذ کے کیڑوں کا نوالہ بن گئے۔ میڈم کا پرس مانند محافظ خانہ تھا جس میں سکول کی حد بندی کے کاغذات' ووچر' آرڈر وغیرہ وغیرہ جمع رہتے تھے یہی وجہ تھی کہ پرس کا وزن بہت بڑھ گیا تھا جس کو دو دو چپراسی اُٹھا کر بس تک پہنچا دیتے۔ سواریاں اور ڈرائیور یہ دیکھ کر ششدر ہو کر رہ جاتے۔ بس میں وارد ہونے سے پہلے میڈم کرایہ طے کر لیتی۔ ۴۰ کی جگہ ۲۰ روپے کہتی یہ سنکر ڈرائیور آگ بگولہ ہو جاتے۔ اب ڈرائیور بھی میڈم کو دیکھ کر سیدھا چلے جاتے اور روز دیر تک سواری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

میڈم بہت چڑ چڑی ہو گئی تھی بات بات پر ملازموں سے غصہ کرتی یہی وجہ تھی کہ ملازم اس ماحول سے تنگ آ چکے تھے۔ مگر کرتے کیا۔ میڈم کو نکال باہر کرنا بہت مشکل کام تھا۔ وہ اکثر یہ کہہ کر ان پر رعب جما دیتی کہ میری رسائی چیف منسٹر تک بھی ہے اور

سب کی گھگی بندھ جاتی اُس کی آفیسری کے چرچے عام ہو گئے تھے وہ ضلعی سطح کی میٹنگوں میں اپنے ہی سکول کو بحث کا موضوع بنوالیتی اور اپنے ماتحت ملازموں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سناتی۔ جیسے وہ کوئی داستان گو عورت تھی اور میٹنگ میں موجود آفیسر بھی اُس کو غور سے سن لیتے وہ میٹنگ کا اصل مدعا و مقصد ہی بگاڑ کر رکھ دیتی پھر جب سبھی اکتا جاتے تو میڈم کو چپ ہونے کے لئے کہتے یا میٹنگ ہال چھوڑ کر چلے جاتے۔ میڈم نے اپنے سکول کا ماحول درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا تبھی تو روز ایک نئی کہانی جنم لیتی اب ملازم بھی ٹولیوں میں منقسم ہو کر ایک دوسرے کو طرح طرح کی کہانیاں سناتے رہتے۔ کئیوں کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر جاتی اور کئی سنکر سنجیدہ ہو جاتے۔ اب سکول میگزین کا نام بھی ہزار داستان رکھا گیا یوں تو یہ ایک پرندے کا نام ہے جس کے گھونسلے کے اردگرد میڈم نے کچھ ملازم ڈیوٹی پر لگا دیئے اور ان سے کہا۔

''یہ پرندہ جونہی گھونسلے سے باہر آئے تو اس کا فوٹو کھینچ لینا۔ میگزین پر چھپوا دیں گے۔''

تب سے کچھ ملازم اس پرندے کے اشاروں پر ناچتے رہے آخر پرندے نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنی حرکتیں محدود کر دیں اور ملازموں نے بھی راحت کی سانس لی۔ ceo صاحب نے بھی اس سکول کی ساری داستان سن لی تھی انہیں بھی میڈم کی طاقت کا اندازہ ہو چکا تھا تبھی ان کے کلرک میڈم کے ساتھ خط و کتابت کرنے میں احتیاط برتتے۔ میڈم پورے ٹاون میں مشہور ہو چکی تھی اس لئے گاڑیوں، دفتروں اور سکولوں میں اس کے کارنامے دہرائے جاتے۔

میڈم کو روز لمبا سفر طے کر کے آنا پڑتا تھا اب تھکی تھکی سی معلوم ہو رہی تھی تین سال گزر چکے تھے شاید اب سکول سے بدلی چاہتی تھی۔ اُس روز منسٹر صاحب تیسری

بار سکول کے دورے پر آئے۔ بچوں نے سکول کے بگڑتے ماحول کی شکایت کی اور میڈم کی بدلی کی بات بھی کی۔

''میڈم کو اپنے ہی علاقے میں تعینات کیا جائے گا''

منسٹر صاحب انہیں یقین دلا کر چلے گئے۔ اب ملازموں کو میڈم کے جانے کا پورا اطمینان ہوا۔

پھر ایک دن سکول میں بڑی گہما گہمی تھی۔ عمہ جو کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔ رشید جوس پی رہا تھا وہیں رفیق کو میڈم کے جانے کا افسوس ہو رہا تھا اُس کے چہرے پر گمبھیرتا تھی کچھ ملازم باہر کی طرف دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ کچھ کے ہاتھ میں چائے کی پیالیاں تھیں آفس کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کچھ کے چہرے کھلے ہوئے اور کچھ ملازم پریشان لگ رہے تھے ہزار داستان بھی چھت پر آ کر پھد کنے لگا تھا اس بیچ کسی نے کلرک کو آواز دی۔

''یس میڈم''

ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہی چاروں طرف قہقہے گونج اُٹھے۔ کہیں سے آواز آئی۔

''یہ میڈم نہیں ہے''

کلرک ہکا بکا ہو کر سب کو دیکھنے لگا۔۔ سارے ماحول کا جائزہ لیتے ہی اُس کے چہرے پر خوشی کے آثار جھلکنے لگے۔ طلاب بھی ہشاش بشاش لگ رہے تھے شاید ان کے دلوں میں بھی ایک پُرسکون ماحول کی اُمید جاگ چکی تھی جس کی بہت ضرورت تھی اُس روز کلرک صاحب وقت پر گھر پہنچ گئے اور ہزار داستان بھی آخر اُڑ کر رفو چکر ہو گیا۔ کیونکہ وہ میڈم جا چکی تھی۔



پوسٹ مارٹم

اُس کی لاش کو صحن میں رکھی چارپائی پر لیٹایا ہی جا رہا تھا کہ ایک غیر ریاستی خاتون حویلی کے صدر دروازے کو زور سے ہلا کر اندر داخل ہوئی اور زمین پر پاؤں پسارے چھاتی پیٹنے لگی اُس کے ہمراہ ایک نو دس سال کا بچہ بھی تھا جس کی آنکھوں سے آنسوں بہہ رہے تھے۔ وہ خاتون کا پلّو اس انداز سے کھینچتا رہا گویا اُسے چارپائی کی طرف آگے بڑھنے کے لئے کہہ رہا ہو آخر لوگوں کے ہجوم سے دھکم پیل کر کے دونوں شہاب الدین کی لاش کے قریب پہنچ گئے جہاں اُس کے سگے سمبندھی رو رہے تھے۔ دُبلا پتلا بچہ کھینچ تان کے لاش کے قریب پہنچتے ہی زور زور سے رونے لگا اور خاتون سے مخاطب ہو کر بولا۔

''مما۔۔میرے بابا صاحب کو کس نے مارا ہے'' یہ سُنتے ہی سب ششدر ہو کر رہ گئے اور پھر چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

''شہاب الدین کو مار دیا گیا ہے''

تعجب اور حیرانگی کے ساتھ ایک آدمی نے کہا۔اُس کے عقب میں موجود دوسرا ایک آدمی بول اُٹھا۔

''ہاں بھئی۔۔اس سماج میں یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔جہاں مادہ پرستی نے اس قدر زور پکڑا ہو کہ ہزار روپے کی خاطر انسان جان کے جنجال میں پھنس جائے۔''

''تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔کچھ بھی ممکن ہے لوگوں کا خون جو سفید پڑ گیا ہے

لوگوں کے دل ودماغ پر لالچ اور حرص کا غلبہ ہو گیا ہے۔''

دونوں میں گفتگو طول پکڑتی گئی۔شہاب الدین کے بھائی اس جمگھٹے میں موجود تھے انھیں یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اُن کا بڑا بھائی اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔حالانکہ یہ بات سبھی جانتے تھے کہ اُن کے ناروا سلوک نے ہی شہاب الدین کو طرح طرح کی ذہنی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔اور وہ کئی سالوں سے دل اور دمّے کے عارضوں سے جوجھ رہا تھا اُسے وقفے وقفے سے دل کے اتنے سخت دورے پڑتے کہ کئی پہروں تک جسم سُن ہو جاتا اور پاس میں موجود لوگ سمجھتے کہ یہ جان بہ حق ہو گیا۔ایسا کئی مرتبہ ہوا ہے۔پھر اُس کے ہوش میں آتے ہی سب تمسخر اُڑا کر چلے جاتے۔اُس کا چھوٹا بھائی انوار الدین بڑے انہماک اور تعجب کے ساتھ اُس چھوٹے بچے کو گھور رہا تھا اور من ہی من میں سوچتا رہا کہ ''یہ دو چھٹانک کا بچہ کہاں سے آٹپکا جو کُھلے عام مرنے والے کا بیٹا ہونے کا سوانگ رچا رہا ہے۔''

شہاب الدین حویلی میں اکیلے رہ رہا تھا۔عجب مزاج کا آدمی تھا ہر وقت ناک بھوں چڑھاتے نکل جاتا۔اکثر دوران گفتگو کڑوی کسیلی باتیں کرتا اور تو اور مزاج میں اس قدر ناہمواری تھی کہ مخاطب کے ذرا سے اُونچے لہجے پر آگ بگولہ ہو کر صلواتیں سنانے لگتا۔کبھی کبھار ہاتھا پائی کی نوبت بھی آجاتی۔اُس کی تیز مزاجی کی وجہ سے ہی اُس کی گھر گرہستی کو گرہن لگ گیا تھا۔حالانکہ اُس نے دو شادیاں کیں پہلی بیوی اپنی ہی ذات برادری کی تھی جو اُس کی بد اخلاقی اور بدسلوکی کئی سالوں تک سہتی رہی۔پھر اس قدر عاجز اور تنگ آگئی کہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔اور کئی آدمیوں کی انتھک مشقّت کے بعد ہی شہاب الدین اُسے طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔ایسا سننے میں آیا ہے کہ شادی کے بندھن سے آزاد ہوتے ہی اُسکی بیوی نے ایک تولہ سونا پیر صاحب کی درگاہ پر نذر کے طور پر چڑھایا۔شہاب الدین اپنے رویے کی وجہ سے دور دور تک جانے جاتے

تھے۔کوئی بھی اُس کے منہ لگنا پسند نہیں کرتا تھا۔پہلی بیوی سے الگ ہونے کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی سٹپٹاتے پھرتا رہا۔ایک ایک سے کہتا۔

''میرے لئے کوئی سگھڑسی عورت دیکھ لو۔میں دوسرا نکاح کرلوں گا۔''

لیکن سبھی اُس کی باتوں کی ان سنی کر کے چلے جاتے۔شہاب الدین دو ایک سال ادھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے کے باوجود بھی جب دوسرا بیاہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اُس نے ایک بچولئے سے بات کی اور ایک غیر ریاستی خاتون سے نکاح کرلیا۔جو بہت قلیل عرصے تک اُس کے گھر میں رہی۔اوراس دوران وہ کبھی شہاب الدین کے بھائیوں سے روبرو متعارف نہیں ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ اس خاتون کو دیکھ کر سب تذبذب میں پڑ گئے۔اس دوران شہاب الدین کا ایک بھائی اُس کا بینک اکاونٹ چیک کر کے آیا اور دھیمے لہجے میں انوارالدین سے کہا۔

''بھائی صاحب کے بینک اکاونٹ میں پانچ کروڑ روپے ہیں۔''

یہ سنتے ہی انوارالدین اندر ہی اندر بلیوں اچھلنے لگا۔اور سر گوشی میں چھوٹے بھائی سے کہا۔

''تم جوں توں کر کے اُس ڈائن عورت کو اندر لے آؤ۔میں اُس کی خبر لیتا ہوں۔''

کچھ ہی دیر میں جب وہ اندر آئی تو انوارالدین نے بڑے کربناک انداز میں کہا۔'

''مان نہ مان میں تیرا مہمان۔تم کون ہو جی۔اور یہ کیا سوانگ رچا رکھا ہے۔یہاں سے چلی جاؤ۔ورنہ میں پولیس کو بُلا لوں گا۔''

یہ سنتے ہی اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔اور بظاہر سہمی سہمی سی لگنے لگی۔پھر جلد ہی دل کو مضبوط کر کے مخاطب ہوئی۔

''پولیس کو اب تک تو آنا چاہیے تھا۔''

اور ادھر اُدھر تاک جھانک کر کے باہر چلی گئی۔ انوارالدین اندر ہی اندر غصّے میں اناپ شناپ سوچنے لگا۔ پھر باہر جا کر رونی صورت بنائے غسال سے کہا۔

''بھائی صاحب کو غسل دینے کی تیاری کیجیے۔''

شہاب الدین کی لاش کو جونہی غسل خانے کی طرف لے جانے لگے۔ عین اُسی لمحے پولیس کی ایک پارٹی اندر داخل ہوگئی۔ انسپکٹر نے غصّہ بھرے لہجے میں کہا۔

''کوئی لاش کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔''

خاتون انسپکٹر کے راستے میں آ کر روتے بلکتے بول اُٹھی۔

''انسپکٹر صاحب میرے خاوند کا پوسٹ مارٹم کروا دیجیے۔''

''پوسٹ مارٹم''

شہاب الدین کے بھائی حیرانگی کے عالم میں یک زبان ہو کر بول اُٹھے۔

خاتون نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا،

''انسپکٹر صاحب میرے خاوند کو مار دیا گیا ہے۔''

انوارالدین اس خاتون کے رویے پر برہم ہو کر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ چھوٹے بھائی نے آنکھ کے اشارے سے چپ رہنے کے لئے کہا۔ اور قریب آ کر سرگوشی کی۔

''بھائی صاحب کا پوسٹ مارٹم ہونے دیجیے۔ کم سے کم اس بات کی تصدیق تو ہو جائے گی کہ وہ جان بحق ہو گئے ہیں اس عورت سے بعد میں نپٹ لیں گے''

''ارے پاگل اگر رپورٹ منفی آئی تو ہم سب مصیبت میں پڑ جائیں گے۔''

''آپ فکر نا کریں۔ بھائی صاحب کی نیچرل موت ہو گئی ہے پھر بھی میں ڈاکٹر صاحب سے بات کر لوں گا۔''

اتنے میں انسپکٹر صاحب نے لاش کو ایمبولنس میں رکھنے کا حکم دیا۔اور پولیس والوں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بڑی پُھرتی کے ساتھ لاش کو ایمبولنس میں رکھ دیا ۔سبھی اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔خاتون بمشکل ایمبولنس میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوئی۔وہ سرگوشی کرتے ہوئے اپنے بچے کو کچھ سمجھا رہی تھی۔کچھ وقفے کے بعد وہ اسپتال پہنچ گئے۔لاش کو سٹریچر پر لاد کر ایمرجنسی وارڈ میں پہنچایا گیا۔اور ڈاکٹر صاحب لاش کا معائنہ کرتے ہی بول اُٹھے۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس کی نیچرل موت ہوئی ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب پھر پوسٹ مارٹم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔خواہ مخواہ لاش کی بے حرمتی ہو جائے گی ۔''انوارالدین نے کہا ۔

اس پر خاتون تلملاتے ہوئے بول اُٹھی۔

''ڈاکٹر صاحب لاش کا پوسٹ مارٹم کرانا بہت ضروری ہے ان کو مار دیا گیا ہے۔''

خاتون کے سخت اصرار پر لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ایک گھنٹے کی مشقّت کے بعد ڈاکٹر صاحب باہر آئے تو خاتون نے جیب سے کاغذ نکال کر اُن کی طرف بڑھا دیا۔کاغذ پر لکھا تھا۔

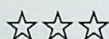
''میری موت کے بعد میرے دونوں گردے کسی حاجت مند کو دیے جائیں۔''

یہ دیکھ کر انوارالدین کو پورا یقین ہوا کہ یہ عورت ایک ڈھونگی ہے اور جب تک اُسے معلوم پڑا کہ یہ انسانی اعضاء کا کاروبار کرنے والی ایک بہروپی ہے۔وہ دونوں گردے پیک کروا کے جا چکی تھی انوارالدین نے شکر بجا لایا کہ گھر آئی بلا آخر ٹل گئی۔اتنے میں انسپکٹر صاحب نے آکر کہا۔

''پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اس بات کی تصدیق ہوئی ہے کہ شہاب الدین کی

نیچرل موت ہوئی ہے اس رپورٹ سے اب سارے خدشات دور ہو گئے ہیں اب آپ لاش کو لے جاسکتے ہیں۔''

دونوں بھائیوں نے اطمنان کی سانس لی اور لاش کو ایمبولنس میں لاد کر گھر کی طرف چل پڑے۔ جب جب لوگ لالچ میں آجاتے ہیں تو رشتوں کے تانے بانے ایسے ہی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور دلوں سے محبت مٹ جاتی ہیں۔



لمحہ لمحہ کہانی

وہ بستی بھی فضاؤں کی طرح بغیر دیوار کے تھی۔ کھلے در، کھلی کھڑکیاں۔ جہاں لوگ بے روک ٹوک ایک دوسرے کے صحنوں سے گزرتے۔ کسی کے ماتھے پر شکن تک نہیں آجاتی۔ ہر طرف میٹھی میٹھی اور شریں آوازیں سنائی دیتیں۔

'آپا' چاچی' بابا' کاکا۔"

سبھی ایک پیار بھرے ماحول میں رہ رہے تھے ان کے پیار پر رشک کرتے ہوئے پرندے بھی اس بستی سے خاص قربت بنائے ہوئے تھے صبح اور شام کے وقت خوب چہچہاتے رہتے۔ سینکڑوں کی تعداد میں ابابیلیں ہوا میں گشت کرتی رہتیں۔ اور اتنی ہی تعداد میں کوئلیں گھروں کے اردگرد میں ڈیرے ڈال کر کوُ کوُ کرتیں۔ بستی کے ایک طرف سال بھر پہاڑیوں سے جھرنے جھر جھر کرتے ہوئے گرتے رہتے اور نیچے بے لباس بچے نہاتے ہوئے خوب مستی کرتے۔ پھر یہ بچے کبھی ایک گھر تو کبھی دوسرے گھر کے صحن میں کھیلتے رہتے۔ خوب مزے کرتے۔

رمضان اور زیبا ان بچوں میں شامل تھے۔ اکثر چھپا چھپی کا کھیل کھیلتے رہتے۔ ایک گھر میں گھُس کر کھڑکی سے باہر آجاتے اور آنکھ جھپکتے ہی دوسرے گھر میں گھُس کر چھپ جاتے۔ رمضان کو تلاش کرتے ہوئے زیبا تھک ہار کر دم ٹھہرا لیتی۔ پھر اپنی ناکامیابی پر غصہ کرتے ہوئے زور سے زمین پر پاؤں مارتی۔ اور زور زور سے "رمزو۔۔ رمزو" پکارتی۔

رمضانؔ کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی وہ کچھ دیر کے لئے چپ تو سادھ لیتا لیکن زیبا اُس کو چڑانے کے لئے بار بار وُہی کلمے دہراتی رہتی۔ اور اُس کو خوب غصہ دلاتی رہتی۔ تو بالآخر رمضانؔ طیش میں آکر چھت پر رکھی گھاس کے بیچوں بیچ سے نکل کر باہر آجاتا اور اُس کے بال پکڑ کر کھینچتا رہتا۔ وہ زور زور سے چلاتی۔

''رمزو۔۔۔ رمزو۔ میرے بال چھوڑ دو۔ میں آپا سے شکایت کروں گی۔ پھر خوب پھٹکار پڑے گی''

اس پر رمضانؔ اور کس کر بال پکڑتے ہوئے کہتا۔

''آپا سے شکایت کرے گی۔'' آواز بھاری کرتے ہوئے۔

''میں تمہیں زندہ چھوڑوں۔ تب نا۔ تم مجھے ''رمزو۔۔ رمزو'' پکارتی رہو۔ اور میں چپ چاپ سنتا رہوں۔''

''اچھا میں کان پکڑتی ہوں۔ دوبارہ ''رمزو'' نہیں پکاروں گی۔''

پھر رمضانؔ اُس کے بال چھوڑ دیتا۔ وہ ایک دو گز اُسے دور ہٹ کر جب اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرلیتی۔ پھر ایک ہی جھٹکے میں دوڑتی ہوئی۔

''رمزو۔۔ رمزو'' چلاتی۔

اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف شکایتیں کرتے رہتے۔

ایک دن رمضانؔ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے پدر رہا تھا اُس کے ہاتھ میں گلی تھی وہ آنکھ بند کرکے ڈنڈے پر نشانہ سادھتے ہوئے گلی مارنے ہی والا تھا کہ زیباؔ چھپتے چھپاتے دبے پاؤں آکر ڈنڈے پر جھپٹی اور ڈنڈا لے کر بھاگ گئی اور سب بچے اُس کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔ رمضان چلاتا رہا۔

''زیبا ڈنڈا واپس کردو۔ اب میں بشیر کو پدانے والا ہوں۔''

اس پر وہ کھلکھلاتے ہوئے کہتی۔

"تم ہمیشہ پڑتے رہتے ہو اُس کو کیا پڑاؤ گے"

پھر وہ دوڑتے ہوئے آ جاتی اور ڈنڈا رمضان کو لوٹاتے ہوئے کہتی۔

"دیکھ رمزو مجھے تمہارا پڑنا اچھا نہیں لگتا ہے"

اس پر بشیر اُس کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہتا جو اندر ہی اندر زیبا کو چاہنے لگا تھا اسی پیار بھرے ماحول میں ہنستے کھیلتے ہوئے انھوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے۔اب ان میں الگ طرح کے جذبات انگڑائیاں لے رہے تھے اور دونوں ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہتے۔ایک لمحے پر رمضان نے کہا۔

"زیبا تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو"

یہ سن کر وہ اندر ہی اندر خوش ہوئی اور کچھ توقف کے بعد بولی۔

"اللہ کی عنایت ہے۔۔رمزو ایک بات پوچھوں"

"ہاں۔۔ہاں پوچھو"

"ایک دن میں یہ بستی چھوڑ کر جاؤں گی۔تمہیں میری یاد آئے گی"

اس پر رمضان منہ بنائے بیٹھا خاموش رہا۔وہ پھر بولی۔

"ہے رمزو۔۔تم بولتے کیوں نہیں ہو۔"

رمضان نے کچھ دیر کے بعد چھیڑنے کے انداز میں اُسے کہا۔

"تم ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہوگی بشیر بھی جو اسی بستی میں رہتا ہے"

"دیکھ رمزو اُس کمبخت کا نام مت لو۔وہ کسی بھی صورت میں میرے لائق نہیں ہے میں اللہ کے فضل وکرم سے بہت خوبصورت ہوں۔مجھے کوئی شہزادہ ہی بیاہ کر لے جائے گا۔"

ٹھیک اُسی وقت ایک کوّا ان کے سامنے سے اُڑتا ہوا گزرا تو رمضان نے پھٹ سے جواب دیا۔

"زیبا وہ دیکھ کوّا جا رہا ہے تم اسی سے بیاہ کرلو وہ تمہیں اُڑا کر لے جائیگا۔"

''دیکھ رمزو اب ہم بچے نہیں رہے اور بار بار مذاق کرنا مجھے پسند نہیں۔''
دونوں کچھ دیر کے لئے سوچوں میں غرق رہے۔ پھر زیبا چپی توڑتے ہوئے بول اُٹھی۔
''رمزو۔ کل شام بابا میرے بیاہ کی بات کر رہا تھا آپا نے صاف منع کیا۔'' بولی
''ابھی زیبا چھوٹی ہے۔ دو تین سال کے بعد دیکھ لیں گے''
''تو ٹھیک ہی کہا ہے آپا نے۔ تین سال انتظار کر لو۔ پھر کسی کوّے سے بیاہ کر کے چلی جانا۔''
اس پر وہ غصہ بھرے لہجے میں بولی۔
''رمزو جا۔ میں دوبارہ تم سے کبھی بات نہیں کروں گی''
اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ ایک ہی جھٹکے میں اُٹھ کر چلی گئی رمضان کو اس بات کا جلد ہی احساس ہوا کہ وہ خواہ مخواہ زیبا کو تنگ کر رہا ہے اور غالباً اپنی اس حرکت پر پچھتا بھی رہا تھا پھر تیز تیز ڈگ بھرتے ہوئے زیبا کے تعاقب میں اُس کے گھر پہنچ گیا اور اُس کی ماں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔
''آپا زیبا پھر مجھ سے لڑ کے آئی ہے''
''کیوں بیٹے کیا ہوا''
''اُسی سے پوچھ لونا''
اتنے میں زیبا اندر کیچن میں آئی اور منہ بنا کر بول اُٹھی۔
''آپا رمزو مجھے بہت تنگ کر رہا ہے''
''رمزو کیوں میری لخت جگر کو تنگ کر رہے ہو۔ آئیندہ محتاط رہنا نہیں تو بہت ماروں گی''
''لیکن آپا۔ شرارت تو وہی کرتی ہے''
''نہیں آپا۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے''۔

زیبا نے غصہ بھرے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔
''آپا۔اُس نے کہا۔۔'' زیبا نے سر نیچے کر کے چپی سی سادھ لی۔
''کیا کہا بیٹی'' ماں بے تابی سے بولی۔
''اُس نے کہا کالے کوّے سے بیاہ کر کے دور چلی جاؤ۔وہ ایسے ہی تنگ کرتا رہتا ہے''
''بدمعاش میری بیٹی کو تنگ کرتا ہے۔آؤ۔۔میں تیرے کان کھینچتی ہوں۔''
''آ۔۔۔آ۔میرے کان چھوڑ دو آپا۔''
اور کان چھڑاتے ہوئے دوڑ کر بھاگ گیا۔ماں نے بیٹی کی طرف منہ کر کے کہا۔
''دیکھ زیبا۔تم اب بڑی ہوگئی ہو۔اب تمہارا بیاہ ہوگا۔اور تم سسرال چلی جاؤ گی اب یہ طفلانہ حرکتیں کرنا بند کردو۔کچھ شرم لاج باقی ہے کہ نہیں''
''آپا میں ابھی کہے دیتی ہوں۔میں کسی دوسری بستی میں بیاہ کر کے نہیں جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔زیبا کی ماں کو اُس کے بیاہ کی فکر لاحق ہوگئی۔اُسنے اپنے خاوند سے کہا۔
''میں نے تمہاری کل والی بات پر بہت سوچ بچار کیا۔میں سمجھتی ہوں تمہاری تجویز بجا ہے ہمیں زیبا کی شادی کردینی چاہیے۔
''ٹھیک ہے زیبا کی ماں۔''
میں سوچ رہی ہوں زیبا کی شادی اسی بستی میں کریں۔یہ ہماری اکلوتی بیٹی ہے نظروں کے سامنے رہے گی''۔
پھر تین ماہ بعد زیبا اور رمضان کی شادی روایتی دھوم دھام کے ساتھ ہوئی۔دونوں خوشیوں سے پھولے نہ سمائے۔شادی کے بعد بھی زیبا پہلے کی طرح شام کو ساری بستی گھوم آتی اور ہر ایک کی خیر و عافیت پوچھ لیتی۔

”کاکا۔۔کاکی۔کیسے ہو“

سب اُس کو دعائیں دیتے رہتے۔غرض زندگی بڑے پیار ومحبت اور امن وامان کے ساتھ گزر رہی تھی۔

پھر ایک سال کے بعد زیبا کے بطن سے ایک ننھے سے بچے نے جنم لیا۔سب کی باچھیں کھل گئیں بستی میں جیسے عید کا اعلان ہو گیا۔عورتیں مرد جوق در جوق رمضان کے گھر جا کر اُسے مبارکباد دیتے رہے۔سب رمضان کی خوشیوں میں ایسے رنگ گئے گویا اُن ہی کے گھر اس ننھے سے فرشتے نے جنم لیا ہو۔بچے کی پرورش بڑے لارڈ پیار سے ہوئی اور زیبا بچے کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر باغ باغ ہو رہی تھی دونوں نے خوشیوں کے موسم میں قدم رکھے ہی تھے کہ اچانک اُس لمحے پر اُن کی زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا جب پاس والی بستی کی راحتی ماسی نے سالوں پرانا یہ بھید کھول دیا کہ۔

”رمضان اور زیبا رضاعی بھائی بہن ہیں۔“

یہ سنتے ہی رمضان دیوار سے سر ٹکا کر زار زار رونے لگا۔اُس کا سر چکرا گیا۔وہ خود ہی سے بڑبڑا رہا تھا۔

”یہ کیسا کبیرہ گناہ ہم سے سرزد ہوا۔میرے اللہ مجھے معاف کرنا۔“

پھر زیبا کے قریب آ کر تین بار”طلاق۔۔طلاق۔۔طلاق“دہرایا۔زیبا تاسّف اور حیرانگی کے ساتھ اُس کو کچھ دیر تک تکتی رہی پھر اپنی دونوں مٹّھیاں بند کر کے پاس والے دریا کی طرف دوڑی اور ایک ہی جست میں کود کر پانی کے تیز بہاؤ میں بہتی رہی کہ اچانک آواز گونجی۔

”زیبا میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔“

پہاڑی سے بشیر نے دریا میں چھلانگ لگائی۔



سکوت

درختوں کے پتّوں کی سرسراہٹ اور نہ ہی پرندوں کے پر پھڑپھڑانے کی آواز سنائی دیتی۔ فضا میں دُور دُور تک کوئی پرندہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ کہیں دُور چلے گئے تھے۔ کتّوں کی ہڑبونگ بھی سنائی نہیں دیتی۔ وہ بھی خوف اور ڈر کے مارے بیابانوں کا رُخ کر چکے تھے کیونکہ وہ جان چکے تھے کہ اس شہر میں انسان محفوظ نہیں ۔۔ انسان انسان کو مار رہا ہے ۔۔ تو اُنکی کیا بساط ۔ ہزاروں رینگنے والے کیڑے مکوڑے بھی غائب ہو گئے تھے کیونکہ اُنھوں نے اپنے ہم جنسوں کو بارود کے الاؤ میں جلتے ہوئے دیکھا۔ حاکم شہر نے، جو اپنی گدی بچانے کے لئے ٹیر گیس، پیپر گیس، پیلٹ گن استعمال کروائے تھے جن سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ مضروب ہو چکے تھے ۔ کچھ آنکھوں کی بصارت سے بھی محروم ہو گئے۔ لوگ حاکم کو گدی سے اُتار پھینکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جبھی سے ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی جیسے سارے شہر کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ حاکم نے اتنے سخت پہرے لگوا دیئے کہ ہر ایک فرد گھر میں ہی مقید ہو کے رہ گیا۔ عبدالوحید کچھ عرصہ پہلے ہی امریکہ سے اپنی بیوی اور بیٹے کے ہمراہ گھر واپس لوٹا تھا اور کئی ہفتوں سے گھر میں ہی محصور رہے۔ کسی کو بھی گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ بچے، بوڑھے، مرد، عورتیں سب کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی جیسے گائے بیل کی ناک میں نکیل ڈال دی گئی ہو۔ عبدالوحید کے بیٹے کو اس قدر گھٹن محسوس ہو رہی تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس شہر میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ غصہ بھرے لہجے میں عبدالوحید

سے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

''ڈیڈ۔ہم کب تک اس گھٹن بھرے ماحول میں رہیں گے۔یہ ماحول ہمیں کل kill کرے گا۔ہم واپس جائیں گے''

دوسری اور سے بیوی روکھے پن سے بولی۔

''ہم نے اب آپ کا شہر بہت دیکھ لیا۔یہاں انسان کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔سب بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکے جاتے ہیں۔ہم اس ماحول میں نہیں اڈجسٹ ہونے کا۔''

عبدالوحید دونوں کے تیور بگڑتے دیکھ کر پریشان ہوا۔اور دونوں کو بھروسہ دلاتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں بولا۔

''مریم ۔۔بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے حالات نارمل ہو جائیں گے اور ہم یہاں کی خوبصورت جگہوں کی سیر کریں گے''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے ہم کچھ اور دنوں کے لئے انتظار کرے گا۔مگر ہر طرف اتنا سناٹا کیوں ہے۔''اُس نے پوچھا۔

''مریم۔کہا تو تھا کہ ایک خوبرو نوجوان کو کل kill کر دیا گیا ہے''

''ہاں ۔۔ہاں وہ معلوم ہے مگر اُس کا قصور نہیں بتایا۔۔''

''قصور۔''چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پھیلائے۔

''قصور کوئی بڑا نہیں ۔۔بس اُس نے آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کی چاہ ظاہر کی''

''تو کیا آپ کے شہر میں 'رائٹ ٹو فریڈم آف لیونگ' نہیں ہے۔اٹ اِز ویری بیڈ۔ہمارا دیس کتنا مہان ہے ہم وہاں آزادی کے ساتھ رہتا ہے۔''

اتنے میں مریم نے ایک چیخ سنی۔اُس کے کان کھڑے ہو گئے وہ ایک دم سے د

روازہ کھول کر باہر کی طرف لپکی اور بغیر ڈر آگے بڑھی۔ عبدالوحید اُس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔

مریم ایک انگریزی نژاد مسلم خاتون تھی بہت ہی خوبصورت۔ گھنے سنہرے بال، گھورے گھورے گال، چوڑا چکلا جسم۔ شہر کے مین چوک میں لاتعداد پولیس والے بندوقیں تانے سڑک کے دونوں اطراف کھڑے تھے اور کسی کو آنے جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔۔ لیکن مریم کو دیکھ کر وہ سب خاموش بت بنے کھڑے رہے وہ ایک پولیس افسر کی طرف مڑ کر بوکھلائی سی بولی۔

''ہے مین۔ ہم کو گھومنے کو مانگتا ہے''

اتنے میں عبدالوحید نے آ کر کہا۔

''مریم واپس گھر چلو!''

''نو۔ نو۔ مین۔ تم چیٹ ہو۔ تم بولا تھا کہ ہمارا شہر جنت ہے۔ اور وہ کیا کہتے تھے تم۔ اگر فردوس۔!''

''اگر فردوس بروئے زمین است۔۔ ہمیں است وہمیں است۔''

عبدالوحید نے شعر دہرایا اور کہا ۔

''میں چیٹ نہیں ہوں۔ میرا شہر سچ میں جنت ہے نہ جانے کس آسیب نے اس کو آگھیرا ہے''

''تو پھر درگاہوں پر نذرونیاز چڑھا دو تا کہ آسیب سے چھٹکارا ملے۔ اور ہم گھوم پھر سکیں''

مریم واپس مڑنے ہی والی تھی کہ اُس کی نظریں ایک ضعیف شخص پر پڑیں جو اپنے گھر کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ وہ ہانپتے ہانپتے اس کے قریب پہنچتے ہی گویا ہوئی۔

''ہے مین۔ کم آؤٹ'' وہ شخص چپی سادھے مریم کو دیکھتا رہا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ فقط اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے پھر کچھ دیر بعد اُس نے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔ مریم من ہی من سوچتی رہی۔

''سب اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر مر رہے ہیں مگر کوئی کچھ نہیں بولتا''

اتنے میں چند پولیس والے ایک نوجوان کو گھسیٹتے ہوئے گاڑی کی طرف لے جانے لگے۔ مریم نے مذاحمت کرتے ہوئے کہا۔

''لیو ہم leave him''۔

وہ نوجوان کو برابر گھسیٹتے رہے یہاں تک کہ اُس کا جسم لہولہان ہوا۔ وہ آپے سے باہر ہوئی اور اُن کا راستہ روک کر بولی۔

you scoundrel چھوڑ دو اُسے۔''

پھر نوجوان سے بولی۔

''ہے مین۔ تمہارا قصور کیا ہے''

وہ ڈر اور خوف کے مارے کچھ نہ بول سکا۔ البتہ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ مریم سوچتی رہی۔

''پرہپس۔ perhaps یہ گونگوں کا شہر ہے کوئی ایک لفظ بھی نہیں بولتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی۔''

مگر وہ ان کے دکھ، درد اور کرب کو جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا، دھوپ میں تمازت بڑھتی جا رہی تھی اور وہ اس چلچلاتی دھوپ کے سبب سر میں درد محسوس کرنے لگی۔ وہ عبدالوحید سے بولی۔

''میں ہاسپٹل جانے کو مانگتا میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔''

اسپتال شہر کے بیچوں بیچ واقع تھا جہاں تہاں کر کے وہاں پہنچے وہ ڈاکٹر سے ملے

جس نے معائنہ کر کے نسخہ لکھ دیا اور دھوپ میں نہ چلنے کی ہدایت کی۔ مریم جاتے ہوئے ڈاکٹر سے بولی۔

''ڈاکٹر صاحب۔ میرا ہسبنڈ بولا تھا کہ میں جنت میں رہتا ہوں اور اسی مغالطے میں، میں یہاں آئی مگر یہاں آ کر میرا دل بہت اپ سٹ upset ہوا۔ یہاں چاروں طرف سکوت ہی سکوت ہے۔ یہ کیا ماجرہ ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے حیرت زدہ ہو کر عبدالوحید کی طرف دیکھا۔ جو اسکی مادری زبان میں کچھ یوں گویا ہوا۔

''ڈاکٹر صاحب میں اسے کیا کہوں کہ ہم اپنے ہی شہر میں مارے جاتے ہیں اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی ہے کوئی ہماری دادرسی کرنے کے لئے آمادہ نہیں''

''ہے مین hay man یہ کیا کُھسر پھُسر ہو رہا ہے۔''

مریم بات کاٹتے ہوئے بولی۔ وہ خاموش ہو گئے پھر مریم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وارڈ میں پہنچ گئی جہاں سینکڑوں کی تعداد میں جوان لڑکے لڑکیاں مضروب حالت میں بیڈوں پر لیٹے ہوئے تھے جن میں اکثر کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں ایک زخمی جوان لڑکی پر نظریں پڑتے ہی اُس کا دل پسیج گیا وہ نم دیدہ ہو کر اُسے بولی۔

''تم کتنا کیوٹ cute ہے میرا بچہ۔ تم کیسے زخمی ہوا ہے'' وہ کچھ نہ بولی فقط آنسوں بہاتی رہی اُس کے آس پاس موجود لوگ بھی چُپ رہے کیونکہ وہ سب حاکم شہر سے ڈرے ہوئے تھے مریم سچائی جاننے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی اُسنے لڑکی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ہاں میرا بچہ تم بتاؤ تم اتنا ڈرا ہوا کیوں ہے۔''

وہ تھرتھراتے ہوئے بولی۔ اس شہر کا حاکم بہت ظالم ہے وہ اپنے وعدے سے

منحرف ہوا ہے۔ مگر اُسے ہمیں ہمارا حق دینا ہی ہوگا ہم برسوں سے اس انتظار میں ہیں کہ آج نہیں تو کل اُس کا دل پسیج جائے گا۔"

"ہاں۔ ہاں میرا بچہ۔ یہ برسوں کی یخ بالآخر پگھل جائے گی اور پانی کے جھرنے نئے سروں میں بجنے لگیں گے پرندے پھر چہچہانے لگیں گے چمن زار پھر مہکیں گے اور یہ سکوت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے گا۔"

"ہاں۔ ہاں۔ سکوت ٹوٹ جائے گا۔"

اور چاروں طرف صدا گونج اُٹھی۔۔



یہ کیسی سزا ہے

ہجوم میں ہر عمر کے لوگ موجود تھے جو تڑکے سے ہی سڑک پر ڈھیرا ڈالے ہوئے تھے لیکن ۔۔! ارشاد۔ وہ کسی بھی طور اس ہجوم میں شامل نہیں تھا وہ روز کی طرح اُس وقت بھی کتابوں کا بستہ کندھوں پر لئے ٹیوشن سنٹر کی طرف جا رہا تھا اپنی ہی دھُن میں مست و مدہوش۔ اُس کے دل میں ہر وقت کچھ کر گزرنے کی تمنّا انگڑائیاں لیتی رہتی۔ ماں باپ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ سماج کے غریب لوگوں کی بھی خدمت کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ خود بھی ایک غریب گھر کا ہی چشم و چراغ تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا۔۔ارشاد۔ بارھویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھا اُس ہجوم کے قریب سے ہی گزرنے والا تھا کہ اچانک پولیس گاڑی دیکھ کر سڑک پر بیٹھے لوگ بھڑک اُٹھے اور ہاتھوں میں پتھر لئے نعرہ لگانے لگے۔

"جاو۔۔جاو۔۔واپس جاو۔"

لوگ حکمران کے مکر فریب سے بے حد تنگ آ چکے تھے وہ اُسے چھٹکارا پا کر اپنے آپ کو محفوظ کر لینا چاہتے تھے وہ ایک نئی دنیا کے متمنی تھے جہاں وہ اپنی مرضی سے جی سکیں۔ مگر حکمران انھیں الگ سے دنیا بسانے کی قطعاً اجازت نہیں دے رہا تھا کیونکہ وہ ان کے وسائل کی بے تحاشا لوٹ کھوسٹ کر کے خوب مزے لے رہا تھا لوگ جگہ جگہ حکمران کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے اور جگہ جگہ دنگے ہو رہے تھے جونہی پولیس والے سڑک پر بیٹھے لوگوں کو تتر بتر کرنے کی غرض سے گاڑی سے نیچے اُتر

آئے۔تو دیکھتے ہی دیکھتے اُدھم مچ اُٹھا۔لوگ پولیس والوں پر بے تحاشا پتھر برسانے لگے۔کئیوں کے سر پھٹ گئے تو کئیوں کی ٹانگیں پتھر لگنے سے مضروب ہوئیں۔پانی سر سے گزرتے دیکھ، پولیس والے بوکھلا گئے انھوں نے اندھادھند ٹیر گیس اور پیلٹ گن چلائے۔لوگوں کی چیخ پکار سے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔وہ گرتے، سنبھلتے، دوڑتے، بھاگتے رہے۔اس بھاگم بھاگ میں ارشاد بھی ادھر اُدھر بھاگنے کی جی توڑ کوشش کرنے لگا مگر وہ ایک گز کے حلقے کے اندر ہی دائیں بائیں پھرکی کی طرح گھومتا رہا۔کیونکہ اُس کی آنکھوں میں پیلٹ گن کے چھرے لگ چکے تھے اور آنکھوں سے خون نکل رہا تھا وہ زمین پر گر کر تڑپتا رہا۔ایک ایک کو پکارتا رہا۔

''کوئی میری مدد کرو۔''

اتنے میں اُس پر غشی طاری ہوئی اور وہ دراز زمین پر ساکت ہو گیا۔پولیس والے ہدایت کے مطابق لوگوں پر خوب تشدد ڈھا رہے تھے مار پٹائی، پکڑ دھکڑ، توڑ پھوڑ، وہ سبھی ہتھ کنڈے آزما رہے تھے کیونکہ اُنھیں شورش کو کسی بھی طور ختم کرنا تھا تا کہ پھر ایک بار حق کی آواز کو دبایا جائے۔مگر وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ وہ بھی اسی نیّا کے مسافر ہیں جس کے کھینے والے یہ احتجاجی لوگ ہیں مگر اُنھیں کیا۔۔۔!وہ تو اپنے وارے نیارے کرنے میں لگے تھے۔اُن کے جاتے ہی کچھ نوجوان کار لے کر آئے اور ارشاد جو زخمی ہو کر بے ہوش پڑا تھا، کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے ایک نوجوان روتے روتے چلا رہا تھا۔

''آنکھیں کھولو۔۔میرے بھائی۔آنکھیں کھولو۔''

خون بہت نکل گیا تھا اور جسم خون میں نہایا ہوا لگ رہا تھا نوجوان اپنی قمیض پھاڑ کر اُس کے چہرے سے خون صاف کرتے ہوئے پھر چلایا۔

''ارے ظالمو۔۔! اب بس بھی کرو۔ اب بہت خون بہا چکے اب طاغوت کا یہ کھیل بند کر دو۔''

پھر ارشاد کو بازوؤں میں بھر کے کار میں لِٹا دیا اور آنکھ جھپکتے ہی اس کو اسپتال پہنچا دیا بیڈ پر لٹاتے ہی وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر کھول نہ سکا۔ معمولی سی حرکت سے اُس کی آنکھوں سے خون نکل جاتا۔

اس نے دبی زبان سے کہا

''میں کہاں ہوں۔ مجھے گھر لے چلو۔

وہ اپنی آنکھیں کھول نہیں پا رہا تھا۔ وہ اپنے بال کھینچنے لگا اور زور زور سے چلانے لگا۔

''مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ میں اندھا ہو گیا ہوں میرے اللہ۔۔ یہ کیسی سزا ہے''

نوجوان نے اس کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''میرے بھائی تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ حوصلہ رکھو۔ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

پھر وہ دبی زبان سے یہ کہتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔

''میری ماں کو بلاؤ''

ٹھیک اُسی وقت ریحان بیگم واویلا کرتے ہوئے ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوئی۔

''کیا ہوا ہے میرے بیٹے کو۔۔ میں واری جاؤں۔''

بیٹے کی حالت دیکھتے ہی وہ دم بخود ہو گئی۔ اور چُپ ہو کر اسٹول پر بیٹھ گئی اور ٹکٹکی باندھے اپنے بچے کو دیکھتے ہوئے غموں کے سمندر میں ڈوب گئی۔ بڑی کشمکش بھری

زندگی جی رہے تھے وہ سختیاں جھیلتے رہے مگر بیٹے کی پڑھائی متاثر نہیں ہونے دی وہ اُس کے روشن مستقبل کے لئے بڑے بڑے خواب دیکھ رہے تھے۔آج اُن کے سبھی خواب، خواب ہوتے نظر آرہے تھے وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ ارشاد بڑبڑانے لگا۔

''ماں۔۔ماں کہاں ہو تم!''

ریحان بیگم اُس کے ہاتھ زور زور سے چومتے ہوئے بولی۔

''بیٹے میں تمہارے پاس ہوں''

''ماں یہ مجھے کس جرم کی سزا ملی ہے میں ایک جیتی جاگتی لاش بن گیا ہوں۔تم کب تک اس لاش کے پاس رہوگی۔''

ریحان بیگم پھوٹ کر رونے لگی اُسے بالکل ضبط نہیں ہو پا رہا تھا وہ بیٹے کی بے بسی صاف صاف محسوس کر رہی تھی بیٹے کو دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔

''بیٹے ایسی باتیں مت کرو۔تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔دیکھنا۔''

اتنے میں ڈاکٹروں کی ایک ٹیم وارڈ میں داخل ہوئی۔اور ارشاد کو سٹریچر پر لٹا کر جرّاحی کے لئے آپریشن تھیٹر میں لے جانے لگے اُس کی ماں روتے بلکتے ڈاکٹر سے عاجزی کرتی رہی۔بولی

''میرے بیٹے کی آنکھیں ٹھیک کر دیجئے۔یہ پھر سے دیکھ سکے۔ڈاکٹر صاحب! میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میرے بیٹے کی دنیا تاریک ہونے سے بچا لیجئے۔میرے بیٹے کو اندھے کی لاٹھی اُٹھانے سے بچا لیجئے۔''

آس پاس موجود لوگ بھی اس ماں کی بے چینی دیکھ کر تلملا اُٹھے اور غموں اور پریشانیوں میں ڈوبے نظر آئے۔اسپتال میں ہر طرف درد سے کراہتی آوازیں سنائی دیتیں۔ہر بیڈ پر معصوم بچوں کی زندہ لاشیں تڑپتی نظر آرہی تھیں جو موجودہ شورش میں

کسی نہ کسی وجہ سے مضروب ہوئے تھے۔ ریحان بیگم آپریشن تھیٹر کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے بے حس سی پاؤں پسارے اس انتظار میں رہی کہ اُس کے بیٹے کا آپریشن کرنے کے بعد ڈاکٹر اُسے اچھی خبر سنا دیں گے۔ اور اُس کے بیٹے کی دنیا روشنیوں سے آباد ہو جائے گی۔ وہ پھر سے دیکھ سکے گا۔ اسی سوچ میں دو تین گھنٹے گزارنے کے بعد جب اُس نے ڈاکٹر کو تھیٹر سے باہر آتے دیکھا تو وہ ایک ہی جست لگا کر اُس کی طرف لپکی اور آس بھری آواز میں پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب۔۔! میرا بیٹا دیکھ سکے گا''

ڈاکٹر کچھ پلوں کے لئے خاموش رہا وہ ایک ماں کی تڑپ محسوس کر رہا تھا جو اُس سے مسیحائی کی اُمید لگائے بیٹھی تھی۔ پھر اُسے دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔

''دعا کرو کہ آپریشن کامیاب ہو جائے۔''

اتنے میں اُس کے بیٹے کو تھیٹر سے نکال کر وارڈ میں داخل کر دیا گیا۔ ریحان بیگم اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کر خون کے آنسو روتی رہی۔ اُس کے چہرے سے اُس کی بے بسی صاف صاف جھلک رہی تھی۔ اُس کے دل میں اُٹھتی درد کی لہریں اُس کے وجود کو تھراتی رہیں۔ وہ سرہانے کے قریب بیٹھ کر بیٹے کو دلاسہ دیتی رہی۔ جو اُسے طرح طرح کے سوال کر رہا تھا۔

''ماں۔ میں اُس ہجوم سے بہت دور تھا۔۔ پھر انھوں نے مجھے اپنے عتاب کا نشانہ کیوں بنایا۔؟ میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا تھا جس کی وہ سزا دے دیتے۔ ماں۔ کیا میری آنکھوں کی بصارت لوٹ آئے گی؟ کیا میں پھر سے دیکھ سکوں گا۔۔ یا۔ یوں ہی زندگی بھر گُپ اندھیروں کے سایے میں تلملاتا رہوں گا۔''

''بیٹے حوصلہ رکھو۔ تمہاری آنکھیں روشنیوں سے پھر جھلملا اُٹھیں گیں۔ تم ان خوبصورت نظاروں کو پھر دیکھ سکو گے''

ریحان بیگم حتی الامکان اپنے بیٹے کا دل بہلاتی رہی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے اندر کوئی منفی سوچ پنپے جس سے اُس کی بصارت متاثر ہو جائے۔

پھر کئی دنوں کے بعد جب اُس کی آنکھوں سے پٹیاں کھولی گئیں سب دوست احباب، رشتہ دار موجود تھے۔ ریحان بیگم پر اُس وقت جیسے قیامت ٹوٹ پڑی جب اُس کا بیٹا زور زور سے چلاتے ہوئے بولا۔

''ماں۔ کہاں گئے وہ نظارے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے''

پھر اپنے بالوں سے چھینا جھپٹی کرتے ہوئے دم توڑتی آواز میں یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

''ماں۔ میں اندھا ہو گیا ہوں''

سب ہچکیاں لے لے کر رونے لگے ریحان بیگم ڈاکٹر پر زور زور سے چلائی۔

''تم کیسے ڈاکٹر ہو۔ میرے بیٹے کو اندھا کر دیا۔''

''مجھے افسوس ہے'' یہ کہہ کر ڈاکٹر چلا گیا۔ پھر اپنے بیٹے کے سینے پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

''تو کیوں میری کوک سے باہر آیا رے۔ میں زندگی بھر تمہیں اپنا خون پلا پلا کر پالتی۔''

''ماں۔۔۔!''

''بول ۔۔ بول میرے بیٹے۔''

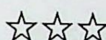
''میں پھر سے بچہ ہو گیا ہوں۔ اب پھر سے مجھے جھولے میں جھلانا ہے لیکن ..... ماں۔ کب تک جھلاؤ گی۔''

وہ پاگلوں کی طرح اُس کے ہاتھ چومتی رہی۔ روتے بلکتے ہوئے بولی۔

''بیٹے عمر بھر جھلاتی رہوں گی۔''

"لیکن ماں یہ کیسی سزا ہے جو تم بھگتو گی۔تم تب بھی بھگت چکی ہو جب میں تمہارے رِحم میں تھا۔اب اور نہیں۔۔۔بالکل نہیں۔تم مجھے دریا میں پھینک دو ۔۔ماں۔۔۔!"

پھر ایک ہی جست میں اُٹھ کر بیڈوں سے ٹکراتے ہوئے وہ وارڈ سے باہر دوڑ پڑا۔



بہت نکلے میرے ارمان

وہ جب منہ کھولتا تو لگتا کہ جیسے دنیا بھر کی مٹھاس اُس کے لفظوں میں آ گئی ہو اپنی میٹھی میٹھی اور شیریں باتوں سے ہر ایک کا دل موہ لیتا۔ ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ اور ہر ایک کے ساتھ ہمدردی جتاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کا دائرہ احباب وسیع ہو گیا تھا جس کسی کی بھی اُس سے نئی نئی جان پہچان ہو جاتی تو وہ پہروں اُس کو سنتا رہتا۔ اگر یوں کہا جائے کہ وہ دل وجان سے اُس پر فریفتہ ہو جاتا تھا تو مطلق مبالغہ نہ ہوگا اُس کا حافظہ بھی بلا کا تھا ہر ایک بات کو ایسے گانٹھ باندھ لیتا کہ جیسے وُہی ان کا منبع ہو۔ بہتیرے لطیفے دماغ کے تہ خانوں میں تہ بہ تہ حفظ کر رکھے تھے کہ جب کبھی سنانے بیٹھتا تو سننے والے ایسے کھلکھلا کر ہنس لیتے کہ کبھی پسلیاں پکڑ کر رہتے تو کبھی دل پر ہاتھ رکھ کر دھڑکنوں کی رفتار کو کم کرنے کی کوشش کرتے۔

ایک بار اُس کی محفل میں آکر کوئی بیٹھ جاتا تو کبھی محفل برخاست کرنے کی چاہ ظاہر نہیں کرتا۔ اس میں ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور تو اور اپنے فرائض منصبی کو انجام دیتے ہوئے خوشی محسوس کرتا۔ کام کی انجام دہی میں ایک منٹ کی کوتاہی ہو جاتی تو پہروں خود کو کوستا رہتا۔ جبھی تو اپنے پرائے سبھی اُس کا احترام کرتے۔

محمد لطیف کئی دہائیوں سے مدرسی کے پیشے سے منسلک تھا۔ وہ اپنے پیشے سے کافی حد تک مطمئن تھا۔ وہ غریب بچوں کو گھر میں مفت پڑھاتا۔ اس نیت سے کہ یہ صحیح ڈگر پر جالگیں اور ان کا مستقبل تاروں کی مانند تابندہ ہو۔ عوض میں یہ غریب اور نادار بچے

خوب دعائیں دیتے رہتے۔ادارے کی سربراہ کی طرف سے کوئی حکم آجاتا تو ’’جی جناب‘‘ کر کے حکم کی تعمیل کرلیتا۔ادارے میں کوئی غیر نصابی سرگرمی کا پروگرام ہوتا تو اس کے سارے انتظامات خوش اسلوبی سے کرلیتا مہمانوں کے لئے طعام کا انتظام بھی گھر میں ہی کروالیتا۔بچوں کے داخلے کی بات ہوتی تو وہ گھر گھر جاکر انھیں اسکول آنے کے لئے آمادہ کرتا۔ان ہی اوصاف کی بدولت وہ اپنے علاقے میں مقبول تھا اور اپنے محکمے میں بھی بڑی عزت وتوقیر کے ساتھ اس کو دیکھا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ وہ طلباء کو ہمہ تن پڑھانے میں مصروف تھا کہ اچانک منسٹر صاحب کی تشریف آوری سے اُتھل پتھل مچ گئی۔کوئی ادھر دوڑ رہا تھا تو کوئی اُدھر۔لیکن وہ معمول کی طرح پُر اعتماد ہوکر طلباء کو پڑھاتا رہا۔منسٹر صاحب مطمئن ہوکر کلاس روم سے باہر آئے۔اور تمام طلباء کو جمع کروایا اور محمد لطیف کو بھی اپنے پاس بلوایا۔پھر مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

’’بچو آج مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہورہا ہے کہ ہمارے محکمے میں محمد لطیف جیسے اُساتذہ موجود ہیں اُستاد ہماری زندگی کو صحیح طرح دینے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ہماری زندگیوں کو سنوارتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسے معمار قوم جیسے اعزاز سے نوارا گیا ہے۔اب وقت آگیا ہے کہ اس اُستاد کو ایک خاص مقام دلایا جائے۔تاکہ سماج کے ہر ایک فرد سے لیکر منسٹر صاحبان تک اس کا احترام کریں اور تو اور اس کی مالی حالت کو بھی مستحکم بنادیا جائے گا۔میں محمد لطیف کو اس سال کے ریاستی ایوارڈ کے لئے نامزد کرتا ہوں۔اور عنقریب انھیں اس ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔‘‘

یہ سنتے ہی طلباء نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں منسٹر صاحب رخصت ہوئے۔اُسکے جاتے ہی کچھ استاد محمد لطیف کے اردگرد جمع ہوئے اور اُسے مبارک باد دیتے رہے اور کچھ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

"ارے بھئی یہ کہتے تو ہیں مگر کرتے کچھ نہیں ہیں زبان دے کر پلٹنا کوئی ان سے سیکھے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ کب سے کہتے ہیں کہ استاد کو ایک اعلیٰ مقام دیں گے۔ مگر آج تک ان کے سارے وعدے سراب ثابت ہوئے ہیں"۔

پھر وہ بھی محمد لطیف کی طرف لپکے جو خوشیوں سے پھولے نہیں سما رہا تھا وہ بہت زیادہ مطمئن لگ رہا تھا۔ اور اُسے اپنے مدرسی کے پیشے پر بہت پیار آرہا تھا وہ یہ خوشیاں اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی بانٹنا چاہتا تھا جبھی تیز تیز ڈگ بھرتے ہوئے گھر پہنچ گیا اور اپنی اہلیہ کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی بتادیا کہ

"مجھے اس سال کا ریاستی ایوارڈ مل رہا ہے۔"

وہ یک زبان ہو کر بولے۔

"سچ"

محمد لطیف نے سر ہلا کر حامی بھر لی۔ وہ سارے خوشیوں سے جھوم اُٹھے۔ ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے رہے۔ پھر کچھ دیر بعد اہلیہ نے پوچھا۔

"کیا ایوارڈ میں کچھ نقد رقم بھی دی جائے گی۔"

"ہاں۔ ایک لاکھ۔"

"کیا۔۔" وہ چونک سی گئی۔ اُسے بالکل یقین نہیں آرہا تھا۔ اُسنے پھر پوچھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو۔"

"ہاں ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

کچھ دیر کے بعد اُسنے ایک کاغذ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ چیزیں ضرور خریدیں گے۔"

"ہاں ہاں ۔۔ضرور خریدیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے کہ "اب ہمارے ارمان پورے ہونگے" اُس کی خوشیاں دوگنی

ہو گئیں۔اور رات دیر تک وہ خوشیوں میں ڈوبے رہے۔

پھر کچھ مہینے گزر گئے۔محمد لطیف کی بے تابی روز بہ روز بڑھتی رہی۔وہ بے صبری سے ایوارڈ لینے کا انتظار کر رہا تھا کہ منسٹر صاحب نے ایوارڈ تقریب کی تاریخ مقرر کی۔پھر کیا تھا۔محمد لطیف کی راتوں کی نیندیں بھی اُڑنے لگیں اب وہ دن رات اُسی مبارک گھڑی کے بارے میں سوچ رہا تھا اس بیچ سال بھی ختم ہونے پر آیا۔خزان کی آمد آمد تھی اور پتے سوکھ کر درختوں سے جھڑنے لگے تھے۔کہ اچانک کچھ سیاسی اُتھل پتھل ہوئی۔کچھ جگہوں پر آگ زنی کے واقعات رونما ہوئے۔جن میں کچھ اسکولی عمارتیں بھی جل کر تباہ ہو گئیں۔سب متفکر ہوئے۔کیا بادشاہ۔۔کیا رعایا۔بلوائی رات کی تاریکی میں آکر آگ لگا کر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے۔انھیں پکڑنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی جو بے سود ہی ثابت ہوئی۔اسی بیچ ایوارڈ تقریب کا دن بھی آیا۔محمد لطیف خوشی اور فکر کے دو پلڑوں میں جھول رہا تھا کہیں کہیں اُسے اعزاز ملنے پر خوشی بھی ہو رہی تھی اور کہیں کہیں اُسے اسکولی عمارتیں جلنے کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی۔

اُس دن محمد لطیف کے گھر پر بہت چہل پہل نظر آ رہی تھی۔سبھی رشتہ دار، دوست احباب اُس کے گھر میں موجود تھے۔ہمسائیوں کے آنے جانے کا تانتا بھی بندھا ہوا تھا ہر ایک کے چہرے سے خوشی کے آثار جھلک رہے تھے محمد لطیف اپنے کچھ رشتہ داروں کے ساتھ تقریب میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔سب کے چہرے کھلے ہوئے تھے اسی بیچ منسٹر صاحب تشریف آور ہوئے اور سارا ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اُٹھا۔محمد لطیف کے رشتہ دار خوشیوں سے پھولے نہیں سما رہے تھے محمد لطیف کے ساتھ ساتھ کچھ اور اُساتذہ بھی اعزازات سے نوازے جانے والے تھے منسٹر صاحب اس پُر ہجوم تقریب سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

"اُستاد قوموں کی تقدیر بنانے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔اسی لئے اس کو

معمار قوم جیسے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔قو میں صرف تعلیم سے ہی ترقی کرتی ہیں اُستاد تعلیم کو عام کرنے میں بے حد محنت کرتا ہے ہم نے اس نونہال پود کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈالی ہے اور اس نے احسن طریقے سے اس ذمہ داری کو نبھایا ہے۔ہم اُستاد کو ایک اہم مقام دینا چاہتے ہیں۔ہم وعدہ بند ہیں۔لیکن کئی مہینوں سے حالات ناساز گار چل رہے ہیں۔اس بیچ کچھ اسکولی عمارتیں جلائی گئیں جن کی مرمت پر اس سال کے ایوارڈوں کی رقم صرف کی جائے گی۔اور تو اور حالات کے چلتے ہم نے ایک اور ذمہ داری اُستاد کے کندھوں پر ڈالی ہے''اور منسٹر صاحب نے ایک بند لفافہ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔''یہ۔۔۔۔''

اسی بیچ محمد لطیف کو اسٹیج پر بلایا گیا۔ہر طرف اُس پر گل باری کی گئی منسٹر صاحب نے اُس کے گلے میں پھولوں کی مالا پہنا دی۔اور بند لفافہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔محمد لطیف کچھ دیر تک یہ بند لفافہ ہوا میں لہراتا رہا۔تقریب ہال تالیوں سے گونج اُٹھا ۔اُس کے رشتہ دار کرسیوں سے کھڑے ہو کر زور زور سے تالیاں بجاتے رہے۔کچھ ہی دیر میں ہال خالی ہو گیا۔اور جونہی محمد لطیف نے لفافہ کھولا تو اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں وہ جلدی جلدی کار میں بیٹھ کر گھر کی طرف چل دیا۔اور شام کے وقت جب وہ گھر پہنچ گیا تو بیوی نے کہا۔

''تمہیں ایوارڈ مل گیا ۔چیک مل گیا۔تمہارے ارمان نکل گئے۔''

یہ سنکر اُس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

''ہاں ہاں۔۔۔۔بہت نکلے میرے ارمان۔''

اُس نے بند لفافہ بیوی کے ہاتھ میں تھما دیا اور تیز تیز ڈگ بھرتے ہوئے اسکول کے احاطے میں پہنچ گیا۔۔اور اسکولی عمارت کے اردگرد چکر کاٹتے ہوئے پکارتا رہا۔

''جاگتے رہو۔۔۔۔جاگتے رہو۔''

☆☆☆

نیا گھر

ایک پہاڑی راستے سے وہ سبھی گرتے سنبھلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ قدم قدم پر گرتے چھوٹے بڑے پتھر انھیں پریشان کرتے۔ مگر اس دشوار گذار راستے کی دشواریوں کو جھیلنے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ انھیں اپنے علاقے سے کوچ کرنا ہی پڑا۔ ذرا سی بارش سے وہاں زمین دھنسنے یا پتھر کھسکنے کا خطرہ رہتا۔ عنایت بیگ اپنے کنبے کو دُور کسی محفوظ جگہ پر ٹھہرانا چاہتا تھا۔ موسم کی حالت خراب تھی۔ اور اس کے تیور بگڑے بگڑے لگ رہے تھے۔ اُس وقت بارشیں ہو رہی تھیں۔ آسمان پر ہر طرف گھنے کالے بادل چھائے ہوئے تھے جو سمے سمے پر ٹکرا کر خوفناک گرج چمک سے انھیں تھراتے جاتے۔

مُنّی عنایت بیگ کی چہیتی بیٹی تھی، جسے وہ بے پناہ محبت کرتا تھا۔ وہ جیسے اسکی کل کائنات تھی۔ حالانکہ اُسکی دو بیٹیاں اور بھی تھیں۔ بڑی والی بیاہی ہوئی تھی جب کہ منجھلی کے لئے رشتہ کی تلاش جاری تھی۔ مگر مُنّی سے اُس کا لگاوٗ جداگانہ تھا۔ وہ جب کام سے تھک ہار کر گھر لوٹتا تو مُنّی دوڑ کر اُس کی گود میں بیٹھ جاتی اور اپنی توتلی باتوں سے اُسکو ہنساتی رہتی۔ مستی کرتی، کبھی اپنے بابا کو گدگدی کرتی۔ عنایت بیگ کی دن بھر کی تھکان مُنّی کی حرکتیں دیکھ کر دُور ہو جاتی۔ اور وہ دن بھر کی تھکان بھول کر رات دیر تک مُنّی سے کھیلتا رہتا۔ مُنّی کھیلتے کھیلتے جب کبھی سنجیدہ ہو جاتی تو بابا سے کہتی۔

''بابا۔ اس گھر کی چھت بوسیدہ ہو چکی ہے۔ جگہ جگہ شگاف پڑ گئے ہیں۔ جن

سے بارش کے قطرے ٹپ ٹپ ٹپکتے رہتے ہیں۔ سر پر گرتے اور۔ بابا۔ اس گھر کی دیواریں بھی کمزور ہوچکی ہیں۔ زلزلے کے ذرا سے جھٹکے سے گر سکتی ہیں۔ بابا۔ ہمارے لئے ایک نیا گھر بنواونا۔"

منّی کی باتیں عنایت بیگ کو نشتر کی طرح چبھ جاتیں۔ وہ اپنی تقدیر کو کوستا رہتا۔ اپنے افلاس کو صلواتیں سناتا۔ منی دس، بارہ سال کی ہی تھی۔ لیکن باتیں بڑی عقلمندی کی کرتی رہتی۔ گھر کے سبھی لوگ اس کو "دانا دید" یعنی دانشمند اماں کہتے۔ اس کی باتیں سنکر عنایت بیگ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگتیں۔ وہ من ہی من میں سوچتا رہتا۔

"منّی تو سچ کہہ رہی ہے۔ یہ مکان بوسیدہ ہو چکا ہے۔ کبھی بھی گر سکتا ہے۔ اللہ نہ کرے اگر ایسا کبھی ہوا تو میں اپنے کنبے کو کہاں ٹھہراؤں۔ یہاں کے موسم کا مزاج بھی وقت بے وقت بدلتا رہتا ہے۔"

عنایت بیگ چلتے چلتے پتھر سے ٹکرا کر سوچوں کی دنیا سے ایکدم کٹ گیا۔ پھر آسمان کی طرف التجائی نظریں کر کے دُعا کی۔

"یا اللہ ہم امان مانگتے ہیں یا اللہ یہ بارشیں تھما دیں۔"

وہ بار باران جملوں کا ورد کرتا رہا۔ یہ بارشیں دیکھکر اُس سے کسی بڑے طوفان کا خدشہ ہورہا تھا۔ وہ ہاتھوں میں چھتریاں سنبھالے چل رہے تھے کہ منّی کی نظریں اس ریسٹورنٹ پر پڑیں جو راستے کے اغل بغل میں ہی آراستہ و پیراستہ ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ اپنے بابا سے ہاتھ چھڑا کر اُس جانب دوڑ پڑی۔ وہاں مٹھائیوں کی ایک دوکان تھی۔ اُسنے مٹھائی والے سے کہا۔

"مٹھائی والے انکل مجھے مٹھائی دو"۔

"دونگا بیٹے۔ پیسے جیب میں ہیں"۔ "پیسے تو بابا کے پاس ہیں۔"

اُسنے کہا۔ پھر مڑ کر بابا کو بُلایا۔

''بابا۔۔۔۔۔۔بابا۔ مجھے مٹھائی لینی ہے۔ پیسے دو نا مٹھائی والے انکل کو۔''

اتنی سی دیر میں عنایت بیگ بھی پہنچ گیا۔ اُسنے منّی کی مانگ پوری کی۔ منّی نے مٹھائی لی۔ اور ریسٹورنٹ کے برآمدے میں جا کر تاک جھانک کرنے لگی۔ اندر ہال میں ٹیپ ریکاڈر پر کوئی گانا بج رہا تھا۔ کچھ جوان لڑکے لڑکیاں نیم برہنہ ناچ رہے تھے۔ چرس، گانجھا، وسکی یا شراب تو کچھ نے پی رکھی تھی ایسا ہی لگتا تھا۔ یہ سب منظر دیکھ کر منّی ہال کے اندر دوڑ گئی۔ ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ناچنے لگی اور آنکھ جھپکتے ہی اس ماحول میں گل مل گئی۔ وہ معصوم تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ ناچ گانا اس معاشرے میں بے حیائی سمجھا جاتا ہے۔ وہ ناچتی رہی جھومتی رہی یہانتک کہ اُس کا سکارف سر سے سرک کر فرش پر گر پڑا۔ یہ دیکھکر عنایت بیگ کے پاؤں تلے زمین سرکنے لگی۔ وہ ان جوان لڑکے لڑکیوں کی حرکات دیکھکر آپے سے باہر ہو گیا۔ اُسنے جا کر منّی کے منہ پر زور سے تھپڑ رسید کرتے ہوئے اُنسے مخاطب ہو کر بولا۔

" ارے کم ظرفو! شرم کرو۔ یہ ناچ گانے کے اڈے بند کرو۔ اس سماج میں برائیاں پنپنے مت دو۔ یہ مسلم سماج ہے ایک شائستہ سماج"۔

ایک لڑکی جھومتی ناچتی ہوئی آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

''انکل۔ ہمارے ساتھ ناچو گاؤ۔ زندگی کے مزے لے لو"۔

وہ پورے ہوش میں نہیں تھی۔ اُس کے منہ سے کڑوی کسیلی بدبو آرہی تھی۔ عنایت بیگ نے ہاتھ چھڑا کر اُسکو تھپڑ مارنا چاہا۔ مگر ایسا کرنے سے جلد ہی اپنے آپ کو روک لیا۔ اور اُسسے کہا۔

''بیٹی۔ یہ نشیلی ادویات استعمال کرنا نقصان دہ اور منع ہے۔ مذہب قطعیٔ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ تم اپنا نقصان کر رہے ہو۔ اپنا ہی سکھ چین برباد کر رہے ہو۔ ان

حرکات سے باز آجاؤ۔"

اُس نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

''انکل۔ایک پیگ تو لے لو۔حلق سے اُترتے ہی ایک نئ دنیا میں قدم رکھو گے۔ جہاں سرور۔بس سرور ہی سرور ہے۔''

''بیٹی جب انسان مذہب سے کنارا کر لیتا ہے تو وہ خرافات میں گمراہ ہو جاتا ہے۔اور ڈوبنا اُسکا مقدر بن جاتا ہے۔تاریخ گواہ ہے۔جب جب قومیں نافرمان ہوئیں تو اللہ نے ان پر اپنا قہر نازل کیا۔سنبھلو بیٹی۔ابھی بھی وقت ہے"۔

اُسنے ٹیبل سے گلاس لاکر عنایت بیگ کی طرف بڑھا دیا۔

''پیو انکل پیو"۔

عنایت بیگ نے چپ سادھ لینے میں ہی عافیت سمجھی۔وہ منّی کو پکڑ کر باہر لے آیا۔اُسے لگ رہا تھا کہ کوئی قوت ہے جس نے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔وہ چاہ کر بھی انھیں روک نہ سکا۔اتنے میں عصر کی اذان کی آواز آئی۔وہ منی کو دیکھتا رہا۔بار بار دیکھتا رہا۔غالباً اُس تھپڑ پر پچھتا بھی رہا تھا جو اُسنے منی کے منہ پر مارا۔

''اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔یہ ہمارا سماج ہے جہاں اذان کی آواز بھی بے حیائی کی خرافات میں بے اثر سی ہو جاتی ہے۔اس سماج کو پھر بدلنے کی ضرورت ہے۔"

وہ ان ہی سوچوں میں تھا کہ منی نے اسکی قمیض کھینچ کر کہا۔"

''بابا۔مجھے وہ گڑیا خرید کر دو۔''

اس خراب موسم میں منی کی یہ بے تکی فرمائش اُس کو غصہ تو دلاتی رہی۔مگر شفقت کی وجہ سے وہ اُسکو کبھی نا نہیں کہتا۔وہ جانتا تھا کہ اس عمر میں کوئی بھی چھوٹ منی کی شخصیت کی تعمیر میں منفی اثر ڈال سکتی ہے۔اتنے میں منی نے دوکان کی طرف اشارہ

کر کے کہا۔

''وہ گڑیا۔ جو اس بڑے طاق پر ہے۔''

''منی یہ وقت گڑیا خریدنے کا نہیں ہے"۔

''بابا۔ میں یہاں سے نہیں ہٹوں گی۔''

''منی تم ہر بات پر ضد کیوں کرتی ہو۔ دیکھو سب انتظار کر رہے ہیں"۔

''بابا۔ میں نئے گھر میں گڑیا کے ساتھ کھیلوں گی۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے منی کے لئے آخر کار گڑیا خرید ہی لی گڑیا ہاتھوں میں لیکر کچھ دیر تک وہ اس ریسٹورنٹ کو دیکھتی رہی اور ایک خوبصورت کاریگری کا یہ نمونہ اس کے دل و دماغ پر منقش ہوگیا۔ اور جونہی وہ اپنے رشتہ دار کے گھر پہنچے تو منی دیر تک کمرے میں بیٹھ کر اس ریسٹورنٹ کا نقشہ کاغذ پر اتارتی رہی۔ اُسنے یہ نقشہ اپنے بابا کے حوالے کر کے کہا۔

''بابا۔ آپ میری کوئی بھی بات ٹالتے نہیں ہو۔ یہ دیکھو۔ میں نے ایک خوبصورت گھر کا نقشہ بنایا ہے مجھے ایسا ہی ایک نیا گھر بنا کے دونا۔"

عنایت بیگ گھر کے دوسرے افراد سے بات چیت میں مصروف تھا وہ موسم کی باتیں کرتے تھے جو پل پل اپنے رنگ بدل رہا تھا۔ ان کے چہروں پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ مگر منی ہشاش بشاش اپنی کلکاریوں میں مست تھی۔ اُسنے پھر عنایت بیگ کو جھنجھوڑ کر کہا۔

''بابا۔ یہ دیکھو۔ نئے گھر کا نقشہ۔"

وہ نقشہ لیکر اُسے بغور دیکھتا رہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد منی سے کہا۔

''منی۔ میں محنت کر کے بہت ساری دولت اکھٹی کروں گا۔ میں ضرور ایک نیا گھر بناؤں گا۔''

منی خوش ہوئی۔ اور گڑیا کو ہاتھوں میں لیکے جُھوم جُھوم کر اُچھلنے لگی۔

''میں اپنی گڑیا رانی کے ساتھ خوب کھیلوں گی۔ اپنے نئے گھر میں"۔

منی کی خوشی دیکھ کر کچھ دیر کے لئے وہ بھی ایسی ہی خوشی کے قالب میں ڈھلتے نظر آئے۔ بارشیں لگاتار ہو رہی تھیں۔ آسمان پر بجلی بھی ہر دم کڑکتی رہی۔ اب آس پڑوس سے طرح طرح کی خبریں آنے لگیں۔"

فلاں علاقے میں بجلی گری۔ کچھ لوگ جُھلس گئے۔ کچھ مکان دب گئے۔ ندی نالے اُبال پر ہیں۔ جہلم میں پانی اُچھل اُچھل کر کناروں سے نبرد آزمائی کر رہا ہے۔ باندھ ڈھنے کا خطرہ ہے۔ چاروں جانب لوگوں میں اضطراب پھیلنے لگا تھا۔ ہاتھ دُعاؤں کے لئے اُٹھ رہے تھے۔ ایسے میں عنایت بیگ کو اپنی بیاہتا بیٹی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ اسکو لینے نکل ہی رہا تھا کہ منی نے قمیض کس کر پکڑ لی۔

''بابا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔''

وہ سسکتی بلکتی رہی۔ لگاتار بارشوں اور کڑکتی بجلی نے اُسکو خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے بابا سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ پہلی بار اتنی برق رفتاری سے بارشیں ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ڈراونی بارشیں۔ عنایت بیگ کچھ دیر تک منی کو تکتا رہا چند ایک بوسے بھی کیے۔ پھر چل پڑا۔ تھوڑی ہی مسافت طے کی تھی کہ ایک زوردار آواز نے اُسکی دنیا ہی ہلا کر رکھ دی۔ اُسکی آنکھوں میں اندھیرا ہو گیا۔ سانس جیسے پھیپڑوں میں ہی اٹک گئی۔ اُس کے سامنے ایک مچلتے پانی کے ریلے نے اُسکی پوری دنیا اپنی لہروں میں سمیٹ لی۔ اور آن کی آن میں بستی جھیل کا رُوپ دھارن کر کے خاموش ہوگئی۔ وہ چیختا چلاتا رہا۔ آنسو ٹپکتے رہے۔ وہ حواس باختہ اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ پھر ایک روز وہ ٹکٹکی باندھے پانی کے خمار کو اُترتے دیکھ رہا تھا کہ پانی کی خاموش رَووں سے آواز سنائی دی۔ جیسے مُنّی کہہ رہی ہو۔

"بابا۔ میرے لئے نیا گھر بنالیا۔ میں گڑیا رانی کے ساتھ کھیلوں گی۔ عنایت بیگ نم دیدہ ان پانیوں کو بے بسی کے ساتھ دیکھتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد اُس ویرانے کی طرف چلا گیا۔ ایک نیا گھر بنانے کے لئے۔ جس میں منّی اب کبھی گڑیا کے ساتھ کھیل نہیں پائے گی۔



سوکھی سوت

گھر میں غضب کی خاموشی تھی کہیں سے بھی کوئی انسانی آواز سنائی نہیں دیتی۔ گھر بستی سے کچھ دُوری پر واقع تھا ارد گرد صرف پرندے اُڑتے نظر آرہے تھے۔

وہ دونوں گھر کے اندر کمرے میں موجود تھے لیکن چپ چاپ' بے حس و حرکت۔ نہ جانے کن سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے کمرے کا کواڑ اور کھڑکیاں چُست بند کر کے رکھے تھے لیکن ایک چوہیا کھڑکی میں پڑے چھوٹے سے سوراخ کے ذریعے اندر گھس آئی تھی جو چھلانگیں مارتے ہوئے کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر دوڑتی۔ ویسے بھی رُومانہ ذرا سی آہٹ سے چونک جاتی چوہیا کبھی نظروں میں آجاتی تو وہ آسمان سر پر اُٹھا لیتی۔ لیکن اُس سمے اس قدر بے سُدھ سی پڑی تھی کہ چوہیا کو بھی کمرے میں خوب کھیل کھیلنے کا موقعہ ملا۔ وہ بے خوف ہو کر ان کے سامنے رقص کرتی رہی۔ اسی اُچھل کود کے دوران وہ آہستہ آہستہ سونگھتے ہوئے رُومانہ کی جانب بڑھ گئی اور اُس کے پاؤں کو دانتوں سے کھرچنے لگی چوہیا کی اس حرکت کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور اسی حالت میں رہی پھر اچانک بم پھٹنے کی زوردار آواز سنائی دی جس سے کھڑکیوں کے شیشے ہل گئے اور وہ ایکدم سے ہوش میں آکر اُٹھ کھڑی ہوئی چوہیا جو آزادی سے گھوم پھر رہی تھی' اس کے پاؤں کے نیچے دب کر نیم مردہ ہو گئی اور غالباً موت کے کگار پر پہنچ گئی چوہیا کی جان نکلتے دیکھ کر وہ بے خوف سی ہو گئی اُس کے دل سے جیسے سارے ڈر نکل گئے لیکن چوہیا کی موت نے اُس کو زندگی کی بے ثباتی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ کچھ

دیر تک من ہی من میں سوچتی رہی اور پھر اپنے میاں شہنوآز سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''میرے نان ونفقہ کا بندوبست کر کے رکھنا''

وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ شہنوآز نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کیوں بیگم۔۔تم کو نان ونفقہ کی فکر کیوں پڑ گئی میں تو ابھی ہٹا کٹا ہوں۔خوب کمار ہا ہوں تم بس لذیذ لذیذ کھانے کھاتی جاؤ اور ہاں بم یہاں سے کوسوں دُور پھٹ گیا ہے نہ جانے کس کس کی جان چلی گئی ہو گی میں تو صحیح سلامت ہوں''

اس پر اُس نے کوئی فوری ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ پھر منہ بنائے کچھ سوچ کر کہا۔

''دیکھو۔ مجھے اس گھر میں رہنے کی گارنٹی چاہیئے ۔یہ زمین جائیداد میرے نام منتقل کر دو''

یہ سُن کر شہنوآز کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور دل ودماغ میں ہلچل مچ گئی وہ ٹکٹکی باندھے اُس کو تکتا رہا۔اور من ہی من میں سوچتا رہا۔

''آج رومانہ اناپ شناپ باتیں کر رہی ہیں کہیں اس پر بھوت پریت کا اثر تو نہیں ہوا ہے۔اس گھر میں رہنے کی گارنٹی چاہیئے بھلا اس کو کونسا خطرہ لاحق ہے''

اس کے دل میں طرح طرح کے خدشات اُبھر رہے تھے۔

''شاید اس کا دل مجھ سے بھر گیا ہے یہ میری موت کا انتظار کر رہی ہے''

شہنواز بدستور سوچوں میں غرق رہا۔

''یہ زمین جائیداد' یہ مکان سب ہمارا ہی تو ہے اور رُومانہ اس گھر کی مالکن ہے اپنے ہی گھر میں اس کو اجنبیت کا احساس ہونے لگا ہے گزشتہ بیس سالوں سے ہم ازدواجی زندگی میں بندھے ہوئے ہیں اچھے بُرے دن ساتھ ساتھ گزارے ہیں پھر اچانک اس کی سوچ میں یہ فتور کیسے پڑ گیا''

شہنوازؔ کے دل میں اس کی یہ بات تیر کی طرح چبھ گئی وہ مایوس انداز میں اپنی جگہ چھوڑ کر کمرے سے باہر جانے لگا کہ رُومانہ نے آواز دی۔

''اس چوہیا کو باہر پھینک دو''

اُس نے چپ چاپ چوہیا کو اُٹھا کر باہر پھینک دیا اور پھر لان میں بے چین سی حالت میں پھرنے لگا۔ رات آہستہ آہستہ چاروں طرف اپنی کالی چادر پسار رہی تھی۔ دور فلک پر تارے بھی ٹمٹمانے لگے تھے شہنواز نے التجائی نظریں آسمان کی جانب کرتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھر لی وہ رُومانہ کی یہ نامناسب سی بات دل کو لگا بیٹھا تھا۔ اور بار بار اس کے دماغ میں یہی بات گونجتی رہی۔

''رُومانہ میری موت کا انتظار کر رہی ہے''

وہ رات دیر تک ان ہی سوچوں میں رہا۔ رُومانہ بہت چست تندرست تھی لیکن اُس کے مقدر میں کھوٹ تھی جو وہ کوئی بچہ نہ جن سکی اُس کا بھانج پن اُسکو بہت ستا رہا تھا وہ اُس سوکھی سوت کی مانند تھی جس سے پانی کا نکلنا کب کا بند ہو چکا تھا لیکن شہنوازؔ نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر سب کچھ خاموشی سے سہہ لیا۔ اُس نے اپنی وفاداری بھر پور انداز میں نبھائی حالانکہ اُس میں رتی بھر کی بھی کوئی مردانہ کمی نہیں تھی وہ بار بار سوچ رہا تھا

''رُومانہ کے تیور بدلے بدلے سے کیوں لگ رہے ہیں۔ کہیں اُس دن کی بات نے اس کے دل کے زخم پھر سے کُرید تو نہیں دیئے۔ میں نے باتوں باتوں میں یونہی کہا تھا کہ میں دوسرا بیاہ کرلوں گا اور اس پر وہ کتنا برہم ہوگئی تھی ایک بدمست ہاتھی کی طرح۔ سُسر تو جان کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہٹے کٹے قصائی بھائیوں کیساتھ تیغیں تیز کر کے تو آیا تھا توبہ توبہ ان کی ڈراونی مونچھیں دیکھ کر ہی انسان کا دل بیٹھنے لگتا ہے تہہ خانے میں چُھپ کر کلمہ استغفار ہزار مرتبہ پڑھ لیا تب بمشکل جان بچی تا ایں دم پھر کبھی ایسی بات زبان پر لانے کی جرات نہیں کی۔ سُسر اُس دن

اپنی بیٹی سے کہہ کر گیا کہ اگر اُسنے دوبارہ ایسی حماقت کی تو کہنا کہ بھیڑ کی طرح ذبح کر لوں گا وہ تو روز ہی کچھ بھیڑیں ذبح کر لیتا تھا۔ پشتنی قصائی جو ٹھہرا''

رات جوں توں کر کے گزر گئی۔ صبح دونوں رُوبرُو کیچن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ شہنواز نے پھر سے اُسی موضوع کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''تم آج کل یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو۔ تمہیں کس چیز کی گارنٹی چاہیے۔ یہ زمین جائیداد سب تمہارا ہی تو ہے۔''

اس پر رُومانہ قریب آ کر پیار بھرے انداز میں بولی۔

''پھر یہ پراپرٹی میرے نام کرنے میں کیا ہرج ہے۔ خدانخواستہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو آپ کے کٹھور بھائی مجھے یہاں کی ہوا تک سونگھنے نہیں دیں گے۔ میں کس کے سہارے جیوں گی۔''

یہ باتیں سن کر شہنواز اندر ہی اندر ٹوٹ کر اپنی تقدیر کو کوسنے لگا۔ پھر کچھ دیر کی چپی کے بعد وہ یہ سوچتے ہوئے آگ بگولہ ہو گیا۔

''رشتوں کی بنیاد کسی نہ کسی غرض پر اُستوار ہوتی ہے اور آج رُومانہ نے اس بات کی تصدیق کی۔''

پھر اُسنے غصّہ بھرے انداز میں اُسے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''کس کی موت کب مقرّر ہے اس کا علم کسی کو نہیں ہے میں ابھی حیات ہوں اور تم میرا جنازہ اُٹھنے کی دُعا کرتی ہو۔''

''ایسا مت کہو۔ میں دل وجان سے تمہیں چاہتی ہوں۔ یہ سونی سونی دیواریں دن بھر مجھے کھانے کو آتی ہیں میں اکیلے بیٹھے بیٹھے بہت اکتا جاتی ہوں۔''

''بیگم۔ پراپرٹی تمہارے نام منتقل کرنے سے یہ سونا پن دُور ہو جائے گا کیا؟ میں نے قبل از وقت تم سے کہا تھا کہ بھائی صاحب کے بیٹے کو گود لیں گے تب بھی

تم نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔تم ہرگز نہ مانی۔ہمیں کوئی اپنا ہی تو وارث مل جاتا جوں توں کر کے زندگی کے چار دن گزر جاتے۔''

رومانہ اپنے آپ کو اس گھر میں غیر محفوظ سی محسوس کر رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر شہنواز کو کچھ ہوا تو پراپرٹی پر اس کا کوئی اختیار نہیں رہے گا اور اس کے بھائی اُسے چیل کوؤں کی طرح نوچ نوچ کر کھائیں گے اور اس عمر میں کہاں کہاں در بدر کی ٹھوکریں کھاتی پھرے گی وہ عجب سی ذہنی کشمکش کا شکار تھی کچھ دیر تک وہ شہنواز کو نم دیدہ دیکھتی رہی پھر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ شہنواز فرش پر پیالہ پٹخ کر رہ گیا۔کچھ توقف کے بعد باہر جا کر کار میں بیٹھ کر گھر سے چلا گیا اور کار کو بڑی تیزی کے ساتھ دوڑاتے ہوئے آفس کی اور جانے لگا۔کہ آفس کے بالکل قریب پہنچ کر اس کی کار ایک کھائی میں جا گری۔شہنواز کے سر پر کچھ زخم لگ گئے جن سے خون نکلنے لگا۔وہ بے ہوشی کی حالت میں تھا ارو گرد لوگ جمع ہو گئے جنھوں نے اس کو اسپتال پہنچا دیا اور ساتھ ہی رو مانہ کو بھی حادثہ کی اطلاع دی۔

یہ سن کر رومانہ پر جیسے آسمان ہی ٹوٹ پڑا۔وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔سینہ پیٹتی ہوئی' دوڑتے بھاگتے وہ گاڑی میں بیٹھ کر اسپتال پہنچ گئی۔جہاں سبھی رشتہ دار' بھابیاں اور بھائی موجود تھے جو مڑ مڑ کر ڈاکٹر سے پوچھ رہے تھے

''بھائی صاحب کیسے ہیں کوئی گہری چوٹ تو نہیں آئی ہے بچ جائیں گے نا۔''

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں بھئی مریض بالکل ٹھیک ہے۔کچھ ہی گھنٹوں میں اس کو ڈسچارج کر دیں گے۔''

''چلو چلو۔بھائی صاحب بالکل ٹھیک ہیں۔'' کسی نے آواز دی اور سب چلے گئے۔

شہنوازؔ نے یہ ساری باتیں سن کر آنکھیں کھولیں اِدھر اُدھر دیکھا۔ تو رومانہ پر نظریں پڑیں۔ وہ ایک بے جان لاش کی طرح فرش پر پاؤں پسارے پڑی تھی شہنوازؔ اُس کو عاجزانہ انداز میں کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر من ہی من میں سوچتا رہا۔

''واقعی رشتوں کے تانے بانے کمزور پڑ گئے ہیں سبھی ایک دوسرے کو گدھ کی طرح نوچنے کی تاک میں رہتے ہیں خود غرضی، طمع اور لالچ نے سبھی کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے''

وہ ٹانگیں کھینچ کر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تو بیڈ کے ہلنے کی آواز سے رومانہ چونک کر کھڑی ہوئی اور بے صبری سے بولی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں نا۔''

شہنوازؔ نے سر ہلا کر تسلی دیدی۔ وہ اُس کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولی۔

''مجھے معاف کرنا۔ اس حادثہ کی ذمہ دار میں ہوں۔ میری ہی عقل ماری گئی تھی جو میں ایسی بے تکی سی بات کہہ بیٹھی۔ اُس نے میری جھولی میں اولاد نہیں ڈالی۔ یہ میرا مقدر ہے اور میں ایک سوکھی سوت کی طرح ہوں میں آپ کے آنگن کو سیراب نہیں کر سکی۔''

اور سر اُس کے زانوں پر رکھ کر زور زور سے رونے لگی۔ شہنوازؔ اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگا۔

''ہر انسان کو دنیا میں جینے کی گارنٹی چاہیے مجھے کچھ پراپرٹی رومانہ کے نام کر دینی چاہیے یا۔ طلاق دیکر اُسے میکے بھیج دینا چاہیے۔''

اتنے میں وارڈ بوائے نے آکر ڈسچارج سرٹیفکیٹ ہاتھ میں تھما دیا۔





ریاست جموں کشمیر میں نئے افسانہ نگاروں کی فہرست زیادہ طویل نہیں۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران جو افسانہ نگار سامنے آئے ہیں ان میں چند افسانے تخلیق کر کے افسانوی نقشے پر اپنا نام لکھوانے میں کامیاب ہو چکے ہیں، ان افسانہ نگاروں میں ایف آزاد دلنوی کا نام بھی نمایاں طور پر نظر آنے لگا ہے۔ آزاد دلنوی سچائی اور سادگی کے ساتھ حالات وواقعات کو افسانوی روپ دیتے ہیں ابھی تو اُن کے ادبی سفر کا آغاز ہوا ہے اُن کی منزل ابھی دور سہی لیکن وہ جس حوصلہ مندی سے یہ سفر طے کر رہے ہیں وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب وہ اپنی ادبی صلاحیتوں کے نتیجے میں افسانوی اُفق پر اپنے لئے جگہ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

نور شاہ

ISBN 978-81-924010-9-6



PRINT & DESIGN
AL-HAYAT
PRINTOGRAPHER
GAWKADAL SGR #9419403